طلوع اسلام

جون ۱۹۵۱

-/8/-

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدلِ اشتراک
آٹھ آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۴	جون ۱۹۵۱ء	نمبر ۶

فہرستِ مضامین

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟	۴	۲۔ چودھری بشیر احمد صاحب	
لمعات	۵ - ۱۰	۳۔ خواجہ عباد اللہ اختر صاحب	
سلیم کے نام	۱۱ - ۲۷	باب المراسلات:	۵۸ - ۶۳
(محترم پرویز صاحب)		۱۔ رسول کریم صلعم کی شان اہل میں سوءِ ادبی	
عربی خط	۲۸ - ۴۲	۲۔ رسول اللہ صلعم اور غیب کا علم	
(علامہ اسلم جیراجپوری صاحب مدظلہ)		۳۔ شراب کا استعمال بطور دوائی	
اوقاتِ نماز	۴۳ - ۵۷	۴۔ شب برات	
(سلطان محمد قریشی صاحب)		نقد و نظر۔ (اسلامک آئیڈیالوجی)	۶۴ - ۶۹

(ادبی پریس کراچی میں چھپا)

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟

کہا جاتا ہے کہ دین کے دو اجزاء ہیں۔ ایک قرآن اور دوسرے حدیث۔ دونوں خدا کی طرف سے وحی ہیں اور قیامت تک کے لئے واجب الاتباع۔

رسول اللہؐ خدا کا دین انسانوں تک پہنچانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ حضورؐ نے قرآن کریم کا ایک ایک لفظ لکھوایا۔ ایک چھوڑ قریب چھبیس کاتب اس مقصد کے لئے متعین فرمائے۔ اس کے علاوہ سینکڑوں اصحابؓ کو قرآن حفظ یاد کرایا۔ اُن کا حفظ کردہ بار بار سُنا۔ انھیں خود بھی سُنایا۔ اس طرح قرآن کو کتاب کی شکل میں بھی محفوظ کیا اور الحمد سے والناس تک ایک ایک لفظ زبانی یاد بھی کرایا۔ چنانچہ اپنی وفات سے قبل، حجۃ الوداع میں، لاکھوں مسلمانوں سے اس امر کا اقرار لیا کہ قرآن ان تک پہنچا دیا گیا ہے۔ اور ان کے اقرار کے بعد اس پر خود اللہ کو شاہد قرار دیا کہ میں نے یہ قرآن ان سب تک پہنچا دیا ہے۔

یہ دین کے ایک حصہ کے متعلق ہوا۔

اس کے برعکس، دین کے دوسرے حصے (یعنی حدیث) کے متعلق یہ ہوا کہ ان کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہؐ نے خود مرتب کرایا، نہ کسی اور کو ایسا کرنے دیا۔ نہ کسی کو کوئی حدیث حفظ یاد کرائی نہ کسی کی حفظ کردہ سنی۔ نہ اس کی تصدیق فرمائی۔ چنانچہ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت امت کے پاس کوئی مستند مجموعۂ احادیث موجود نہ تھا۔ نہ رسولؐ نے دیا نہ صحابہؓ نے خود مرتب کر کے اس کی تصدیق رسول اللہؐ سے کرائی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن اور حدیث دونوں دین کے اجزا تھے تو رسول اللہؐ نے جس طرح اہتمام اور التزام کے ساتھ قرآن کو محفوظ شکل میں امت کو دیا اُسی طرح اپنی احادیث کا کوئی مستند مجموعہ امت کو کیوں نہ دیا؟

اگر دنیا کے تمام مسلمانوں میں سے کوئی شخص بھی اس سوال کا جواب دے سکتا ہے تو طلوع اسلام کے صفحات اس کے لئے کھلے ہیں۔ جواب صرف اس سوال کا ہونا چاہئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں نہیں ہونی چاہئیں۔

کوئی ہے جو اس سوال کا جواب دے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کہتے ہیں کہ جب محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دیول گری کو دارالخلافہ بنایا اور اس انتقالِ مکانی کی وجہ سے رعایا برباد ہوئی اور خزانہ خالی ہوگیا تو مشیرانِ سلطنت نے بادب گذارش کی کہ اب خزانے میں روپیہ کہاں سے آئیگا۔ اس پر محمد تغلق نے جواب دیا کہ یہ کونسا مشکل کام ہے۔ ہم دیول گری کا نام دولت آباد رکھ دیتے ہیں۔ خزانہ خود بخود بھر جائیگا۔ مورخین نے محمد تغلق کو دیوانہ قرار دیا ہے۔ بات تھی بھی دیوانہ پن کی۔

لیکن اس قسم کی دیوانگی محمد تغلق کے ساتھ ختم نہیں ہوگئی۔ ہمارے دور میں بھی ایسے دیوانوں کی کچھ کمی نہیں۔

تقسیم ہند کے بعد جب بھارت ورش میں اپنی حکومت قائم ہوئی تو مہا سبھائی ذہنیت نے پراچین سبھیتا (قدیم ہندو تہذیب) کے احیاء کیلئے تحریک شروع کی۔ اسی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ سومنات کے ویران شدہ مندر کو پھر سے آباد کیا جائے۔ اس ارادے نے عزم کی صورت اختیار کی۔ عزم عمل کی شکل میں منتقل ہوا خود حکومت کی طرف سے اس عظیم الشان کام کی ابتدا ہوئی۔ رام راجیہ کے پرستاروں نے بڑھ چڑھ کر چندے دیئے۔ تین چار برس کی مسلسل محنت اور مشقت کے بعد مندر اپنی قدیم روایات کو لئے ہوئے پھر سے تعمیر ہوا۔ مندر میں دیوتا کو از سرِ نو نصب کرنے کیلئے ۱۱ مئی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس مقدس رسم کی ادائیگی کیلئے بھارت یونین کے پردھان راجندر پرشاد کو دعوت دی گئی۔ سارے ملک کے دو دوان برہمن اس مقام پر جمع ہوئے اور اس طرح لاکھوں یاتریوں کے ہجوم میں ایک انسان نے اپنے "خدا" کو اس کے معزول شدہ مقام پر از سرِ نو فائز کیا۔ واضح رہے کہ یہ دیوتا کسی مورتی کی شکل میں نہیں بلکہ لنگم کے پیکر میں استادہ کیا گیا تھا۔ اس تمام جدوجہد، ذوق و شوق، جوش و خروش اور نمائش و زیبائش میں فقط ایک جذبہ کار فرما تھا اور وہ یہ کہ ہندو جاتی نے اس طرح اپنی اس شکست کا انتقام لیا جو اسے سومنات کے مقام پر محمود غزنوی کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی۔

اُدھر یہ ہورہا تھا۔ اِدھر پاکستان میں بھی کچھ مسلمانوں کے دلوں میں جذباتِ حمیت و غیرت نے کروٹ لی اور انھوں نے اعلان کیا کہ ۱۱ مئی کو پاکستان میں جو بچے مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہوں، ان کا نام محمود رکھ دیا جائے۔ چنانچہ اس کے بعد ان لوگوں کی طرف سے یہ بھی اعلان ہوا کہ خدا کے فضل و کرم سے پاکستان میں اتنے سو محمود پیدا ہو چکے ہیں۔

ہندوؤں نے اپنی آتشِ انتقام کے فرو کرنے میں کیا کچھ کیا؟ ہمیں اس سے غرض نہیں، دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہاں مسلمانوں نے اس کا جو جواب دیا اس کی حیثیت کیا ہے؟ انھوں نے ہندوؤں کو شکست دینے کیلئے نہ کوئی [illegible] تیار کی، نہ کچھ سامانِ حرب جمع کیا، نہ دور و دراز مسافتیں طے کیں، نہ پرخطر منزلوں میں سے گذرے، نہ کہیں دھاوا بولا، نہ تلوار اٹھائی۔ بس ۱۱ مئی [illegible] پیدا ہونے والے بچوں کا نام محمود رکھ کر جی میں خوش ہوگئے کہ ہم نے سومنات کے مندر کی تعمیر کا جواب بت شکن حملوں سے دیدیا!

ذرا سوچئے کہ کیا اس میں اور محمد تغلق کے "دولت آباد" میں کچھ بھی فرق ہے؟ فرق صرف اتنا ہے کہ محمد تغلق کے متعلق جو کچھ بعد کے مورخوں نے کہا اسے انہوں نے سن لیا، لیکن جو کچھ ان کے متعلق آنے والا مورخ لکھے گا، اسے یہ نہیں سن سکیں گے۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ اس کیلئے کسی آنیوالے مورخ کے انتظار کی ضرورت ہے۔ کفی بنفسك اليوم عليك حسيبا اس کیلئے انسان کے اپنے نفس کی شہادت ہی کافی ہے بشرطیکہ اس نے اپنی زبان نہ بند کر رکھی ہو۔

یہ تحریک ان حضرات کی طرف سے تھی جنہوں نے اپنا نام "ہندوستان ہمارا پارٹی" رکھ چھوڑا ہے۔ "ہندوستان ہمارا" ایک نہایت خوش آئند اور سامعہ نواز نعرہ ہے لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ انہوں نے اس نعرے سے اپنی تنگ دامانی کا ثبوت کیوں دیا؟ مسلمان کا صحیح نعرہ تو یہ ہے کہ

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!

نہیں، بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے کہ

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث　　مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

یہ کائنات اور اسکی تمام قوتیں انسان کیلئے مسخر کر دی گئی ہیں اور مومن کا مقام عام انسانوں سے کہیں بلند ہے۔ مومن کا مرتبہ تو یہ ہے کہ

مومنے بالائے ہر بالا ترے　　غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

قرآن نے امتِ مسلمہ کو امتِ وسطیٰ یعنی بین الاقوامی امت قرار دیا ہے جس کا مقصدِ حیات یہ ہے لتکونوا شھداء علی الناس، تاکہ وہ تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگراں ہو اور یہ دیکھے کہ کونسی قوم جادۂ حق و اعتدال سے ہٹ رہی ہے اور کونسی انسانی معاشرہ کو متوازن رکھ رہی ہے۔ اور جہاں دیکھے کہ اس معاشرہ میں کوئی ناہمواری پیدا ہو رہی ہے اسے فوراً ہموار کردے اور اس طرح تمام نوعِ انسانی کی نشوونما ارتقاء (ربوبیت) کا سامان بہم پہنچا کر کاروانِ آدمیت کو رواں دواں جانبِ منزل لیجائے۔ یہ ہے مومن کا صحیح مقام اور یہ ہونا چاہیئے امتِ مسلمہ کا نصب العین زندگی۔ مومن اس سے کم پر راضی نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا صرف "ہندوستان ہمارا" کہنا تو بہت ہی پیش پا افتادہ بات ہے۔ مسلمان کا مطمحِ نگاہ اس سے کہیں آگے ہونا چاہیئے۔ یہ ساری دنیا اور اس سے کہیں پرے کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — لیکن یہ سب کچھ دیول گری کا نام دولت آباد رکھ کر یا ۱۱ مئی کو پیدا ہونے والے بچوں کو محمود کے نام سے پکار کر یا اپنی پارٹی کا نام "ہندوستان ہمارا پارٹی" رکھ کر نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے ضرورت ہے ایمانِ محکم کی جسے بالفاظ دیگر زندگی کا واضح اور متعین نصب العین کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد عزمِ راسخ کی جس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک وہ نصب العین حاصل نہ ہو جائے ایک لمحہ کیلئے بھی چین نہ پڑے۔ اس کے بعد ضرورت ہے ان تمام اسباب اور سامان کی جو اس مقصد کے حصول کیلئے درکار ہوں۔ پھر ضرورت ہے اس سعیٔ پیہم اور عملِ مسلسل کی جس سے وہ تمام اسباب و سامان صحیح نتائج پیدا کریں۔

یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان!

جس زمانے میں مسلمان حقائق سے دوچار ہونا جانتا تھا اور زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق اپنے آپ سے شاعری نہیں کرتا تھا، اس کی نگاہ ان تمام عناصر پر ہوتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بحیرہ عرب میں لٹنے والے مسافروں کی فریاد پر دمشق سے لبیک کہنے والا سترہ سالہ محمد بن قاسم ملتان تک کا علاقہ زیرنگیں کرکے دم لیتا تھا اور مٹھی بھر سپاہیوں کو ساتھ لینے والا طارق سپین کو فتح کرکے یورپ کے بیچوں بیچ سیدھا شام تک آ پہنچنے کی سکیم تیار کر لیتا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب مسلمان نے اپنے آپ سے شاعری شروع کی تو اس نے یہ سمجھ لیا کہ اسے نہ عزم و ارادہ کی ضرورت ہے، نہ تیغ و تفنگ کی۔ اسلئے کہ اسے بتا دیا گیا کہ

مرنے والا تو فقط بات سے مرجاتا ہے

اس نے گنتی کے دروازوں کو باب محمد بن قاسم، باب طارق، باب محمود، باب خالدؓ وغیرہ سے موسوم کر کے سمجھ لیا کہ ہم دنیا بھر کے فاتح ہیں۔ اس نے اپنے بچوں کا نام محمود، طارق وغیرہ رکھ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیا کہ اب قوم میں خارا شگاف شمشیر زنوں کی کمی نہیں۔ کتنا بڑا ہے یہ فریب جسے محض ناموں سے اس قوم نے اپنے آپ کو دے لیا ہے، محض نام۔ یہ وہی فریب ہے جسے قرآن نے دنیا سے مٹنے والی قوموں کی طرف یہ کہکر منسوب کیا تھا کہ ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و اباؤکم۔ یہ صرف نام ہیں جنھیں تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ لیا ہے۔ قرآن نے جو کچھ فنا آمادہ قوموں کے متعلق کہا تھا مسلمانوں نے حرف بہ حرف اپنے اوپر منطبق کر لیا۔

یوں تو آج دنیا کے ہر مسلمان کو ضرورت ہے کہ وہ اس قسم کی شاعری چھوڑ کر حقائق کا سامنا کرنا سیکھے لیکن ہم پاکستان کے مسلمانوں کیلئے یہ ضرورت اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ اسکی کئی ایک وجوہات ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ ہماری مملکت بالکل نوزائیدہ ہے۔ پھر یہ کہ یہ مملکت بہت سے حاسدین کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ دوسری طرف یہ کہ یہ خطہ زمین ہماری تمناؤں کا محور، ہماری امیدوں کا مرکز، ہمارے گریہ نیم شبی کا مقصود، ہماری دعائے سحری کا مطلوب ہے جسے اسلام کو پھر سے ایک عملی نظام کی صورت میں نافذ کرنے کی تجربہ گاہ بننا ہے، اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہ باقی ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کی ہمتیں اور حوصلے اسی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس نے نوع انسانی تک قرآن کا وہ پیغام پہنچانا ہے جس سے انسانیت ہر قسم کی معاشی، معاشرتی، ذہنی، جسمانی، روحانی غلبہ و استیلاء سے نجات حاصل کر کے آزادی کی فضائے بسیط میں بال کشا ہو سکے۔ اسلئے اس سرزمین کے مسلمانوں پر نہ صرف اپنے متعلق ہی ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرف سے بھی ـــــ نہیں اس سے بھی آگے، تمام نوع انسانی کی طرف سے ایک بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمارے ہاں کی شاعری نہ صرف ہماری تباہی اور بربادی کا موجب ہو گی بلکہ ہماری تہی دامنی عریانی عالم کا باعث ہو جائیگی۔ ہمیں حقائق کا سامنا کرنا سیکھنا چاہئے اور نہایت مردانگی سے سامنا کرنا۔ اس حقیقت کو ہم بار بار دہرا چکے ہیں کہ ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم پاکستان کو اسقدر مضبوط بنالیں کہ خود اسکی مضبوطی دوسروں کیلئے ہمت شکن بن جائے۔ جب یہ ملک قوی اور مضبوط ہو جائیگا تو پھر وہ بہت سے مسائل جن کیلئے ہمیں آج اپنے بچوں کے نام محمود رکھکر یا اپنی پارٹی کو "ہندوستان ہمارا" کہہ کر اپنے آپ کو طفل تسلیاں دینا پڑتی ہیں، خود بخود حل ہو جائیں گی۔ ملک کی اس مضبوطی کیلئے ہمیں یہ سمجھ کر اپنے آپ کو اطمینان نہیں دے لینا چاہئے کہ یہ حکومت کا فریضہ ہے اور اس کی فوج اس کی ذمہ دار ہے۔ حکومت کے فریضے اور اس کی فوج کی ذمہ داریوں میں کسی کو کلام نہیں، لیکن کسی ملک کے استحکام کا انحصار تنہا فوجوں پر نہیں ہوا کرتا۔ فوج تو صرف مدافعت کی صف اول ہوا کرتی ہے۔ اصل استحکام کا راز ملک کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہم اتنی عظیم الشان مملکت کے مالک ہونے کے باوجود زندہ قوموں کی طرح حقائق کا سامنا کرنے کے خوگر نہیں ہو سکے۔ قوم کے بیشتر حصے کے قلب و دماغ پر ملّا سوار ہے جو اسے توہم پرستیوں کے افسانوں اور موہوم امیدوں کی چیستانوں میں الجھائے رکھتا ہے۔ کچھ ایسے لیڈر ہیں جن کے سامنے ابھی تک زندگی کے وہی مقاصد ہیں جو دور غلامی میں ان کے پیش نظر ہوا کرتے تھے۔ وہی مناصب و مدارج کیلئے تگ و تاز، وہی الیکشنوں کی دوڑ دھوپ، وہی پارٹیوں کے جوڑ توڑ، وہی عزۃ الاثم (جھوٹی عزتوں) کی تمنائیں۔ وہ اپنے ان مقاصد کے بروئے کار لانے کیلئے قوم کو سیاسی پیچیدگیوں میں الجھائے رکھتے ہیں۔ قوم کے سامنے کوئی تعمیری پروگرام نہیں۔ ان کے سامنے اس امر کا کوئی تصور ہی نہیں کہ انھیں یہ مملکت کیوں مل گئی ہے؟ ان کا مستقبل کیا ہے؟ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ بین الاقوامی بساط سیاست پر ان کی کیا حیثیت ہے؟ اقوام عالم کی میزان میں ان کا وزن کس طرح بڑھ سکتا ہے؟ ان مسائل کے متعلق نہ سنجیدہ فکر کے آثار دکھائی دیتے ہیں، نہ اس قسم کی فکر کی تربیت کیلئے کوئی وسائل۔

پیش پا افتادہ مفاد ہیں اور ان کے بعد الفاظ کی شاعری۔ اسوقت ضرورت ہے چند سوچنے والوں کی جو سر جوڑ کر بیٹھیں اور یہ معلوم کریں کہ قوم میں اس قدر تشتت اور انتشار کیوں ہے؟ انھیں ایک دوسرے پر اعتماد کیوں نہیں رہا؟ ان کی بے چینی اور بے اطمینانی کے اسباب کیا ہیں؟ ائتلاف تو ایک طرف تعمیر کی خاطر کیلئے ان میں باہمی تعاون تک کیوں نہیں پایا جاتا؟ قوم کے مختلف عناصر میں باہمی ربط و ضبط کیوں نہیں؟ قوم کے نوجوانوں میں بے راہ روی کیوں پیدا ہو رہی ہے؟ ہم کیوں ایک دوسرے کے شاکی ہیں؟ پوری قوم جسد واحد کی طرح کیوں نہیں ہے کہ پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے اور آنکھ کے آبگینے میں آنسو چھلک آئیں۔ ایک کی مصیبت صرف اسی کی مصیبت بن کر کیوں رہ جاتی ہے؟ ایک کا دکھ صرف اسی کی ذات تک کیوں محدود ہو جاتا ہے۔ باقی افراد ملت اس کی مصیبت میں شریک اور اس کے دکھ کی دوا کیوں نہیں بن جاتے؟ ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے غم میں کیوں مبتلا ہے؟ اور اپنی اپنی فکر میں کیوں پریشان ہے؟ ہمارے دلوں سے مستقل اقدار کی اہمیت کیوں کم ہو رہی ہے؟ ہمارے گھروں کی زندگی کیوں جہنم کا نمونہ بن رہی ہے؟ ہماری مجلسی معاشرت کیوں منافقت اور ملمع کاری کا پیکر بن گئی ہے؟ ہماری آنکھوں کی حیا کو کس کی نظر کھا گئی؟ ہمارے سروں کے وقار کو کونسا روگ اچک کر لیگیا ہے؟ غرضیکہ سوچنے والے سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ

متاع دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

یہی تھے وہ حالات جن کا علاج قرآن نے ایک لفظ میں بتایا تھا جب اس نے کہا کہ قل انی اعظکم بواحدۃ۔ ان سے کہو کہ اس تشتت و انتشار سے نکلنے کیلئے میں تمہیں صرف ایک بات کہتا ہوں اور وہ یہ کہ جو کچھ ہوتا ہی ہونے دو۔ انسانوں کی یہ بھیڑ جس طرف بھی اسے بہے جانے دو۔ کرو یہ کہ ان تقوموا للہ مثنی و فرادی۔ ایک ایک دو دو کر کے اس بھیڑ سے الگ ہٹ کر ایک ثانیہ کیلئے تھم جاؤ۔ کسی اپنی غرض کیلئے نہیں صرف خدا کے قانون کی خاطر۔ رک کر کیا کرو؟ ثم تتفکروا۔ کھڑے ہو جاؤ اور سوچو۔ سوچو کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ۔۔۔ سوچو، کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ ۔۔۔ ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ اور سوچو۔ بس یہی ایک بات ہے کہ جو تم سے کہی جاتی ہے۔ اس بھیڑ کے ریلے میں مت بہے جاؤ۔ ذرا تھم جاؤ، رک جاؤ، کھڑے ہو جاؤ، اور سوچو۔ یہ ہے وہ تدبیر جو ان حالات میں قرآن نے بتائی ہے۔ بات بڑی چھوٹی سی ہے لیکن بڑے ہی پتے کی ہے۔ غور کیجئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے؟ اسلئے کہ ہم نے سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ اور جو قوم سوچنا چھوڑ دیتی ہے وہ "شاعری" میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ وہ حقائق کی دنیا میں نہیں افسانوی دنیا میں زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ محض ناموں کی تبدیلیوں سے اپنے خزانے معمور دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے نام محمود غزنوی رکھ کر سومنات سر کر لینے کے حسین خواب دیکھنے لگ جاتی ہے۔ وہ "ہندوستان ہمارا" قسم کی پارٹی بنا کر سارے ملک کی واحد مالک بن جانے کے سراب آسا تصور میں مگن ہو کر جھومنے لگ جاتی ہے۔ اس افسانوی تعطل کا علاج سوچنا ہے جتنی باتیں خود کہو، ان کے متعلق بھی سوچو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ جو کچھ کوئی دوسرا کہے اس سے بھی پوچھو کہ اس سے اس کا مطلب کیا ہے، سوچنے والوں سے پوچھو کہ جو کچھ ہو رہا ہے کیوں ہو رہا ہے؟ اور اس کا علاج کیا ہے؟ انھیں مجبور کر دو کہ وہ ملکر بیٹھیں اور تمہارے ان سوالات کا حل سوچیں۔ اگر ہم نے اپنے آپ کو ان افسانہ گو مقدسین اور مصلحین کے پنجے سے چھڑا کر خود بھی سوچنے کی عادت ڈال لی اور دوسروں کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تو اس سے یقیناً وہ راہیں ہمارے سامنے کھل جائیں گی جن سے پاکستان کے استحکام کی عملی صورتیں ابھر کر سامنے آجائیں گی۔ جب یہ ہو جائیگا تو اس کے بعد ہم "ہندوستان ہمارا" کہنے کے بھی اہل ہو جائیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ چین و عرب ہمارا اور سارا جہاں ہمارا کہنے کے سزاوار بھی۔ ہم غالی جذبات کی رو میں بہہ جانیوالے بھائیوں سے درخواست کریں گے کہ جب تک وہ سوچ اور بچار کے بعد پہلے اپنی بیماریوں کی تشخیص نہ کر لیں اور اسکے بعد وہ تمام عناصر اکٹھے نہ کر دیں جو دنیا میں فتح و کامرانی کا باعث بنا کرتے ہیں اسوقت تک خدا کیلئے اس قسم کی شاعری سے اپنے آپ کو اور ساری قوم کو فریب میں مبتلا نہ رکھیں۔ اس سے خود ہمیں بھی بڑا سخت نقصان

پہنچتا ہے، اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جن کی خاطر ہم اس قسم کے خیالی منصوبے باندھتے رہتے ہیں۔

---

۲ — رئیس الاحرار محمد علی جوہر نے لکھا تھا کہ

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے — کہ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

جوہر کی اپنی زندگی خود اس شعر کی تفسیر تھی۔ ہمارے حالیہ سیاسی دور میں اس شعر کی تفسیر حسرت موہانی کی زندگی میں بھی ملتی ہے۔ موہانی نے ہمیشہ اپنے سامنے اپنے اصول کو رکھا اور شخصیتوں کی کوئی پروا نہ کی۔ آپ کو ان کے اصولوں سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن اس حقیقت سے قطعاً اختلاف نہیں ہوگا کہ انھوں نے اپنے کسی اصول کیلئے نہ کسی سے مفاہمت (Compromise) کی نہ مداہنت کی۔ اور اگر ضرورت پڑی تو اس اصول پرستی کی خاطر ساری دنیا سے لڑائی مول لے لی۔ انھوں نے اپنی پوری عمر اسی مسلک پر گذار دی اور بالآخر چند دن ہوئے لکھنؤ میں نہایت کس مپرسی کے عالم میں وفات پا گئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!

ساری دنیا سے لڑائی مول لینا ایک جامع سیرت کے صرف ایک پہلو کا نام ہے۔ اس زمانے میں جبکہ بلند سیرت کے نمونے خال خال نظر آتے ہیں کسی انسان میں بلند سیرت کے کسی ایک پہلو کی جھلک بھی کچھ کم مایۂ ناز نہیں ہو سکتی لیکن اس سے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے کہ قرآن جس مومنانہ سیرت کو جامع سیرت قرار دیتا ہے، اس میں بہت سی متضاد صفات پورے تناسب اور توازن کے ساتھ اس طرح یکجا جمع ہو جاتی ہیں کہ ان کا تناقض عین توافق بن جاتا ہے۔ درحقیقت ایک مومن کی زندگی میں حیطۂ بشریت کے اندر صفات خداوندی منعکس ہوتی ہیں۔ اللہ اس Ideal کا نام ہے جس میں متخالف اور متناقض صفات اپنی انتہائی کمالیت کے ساتھ اس حسن توازن سے ایک دوسرے میں سموئی ہوئی ہوتی ہیں کہ اس سے زیادہ کامل توافق تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ انہی کا عکس چھوٹے پیمانے پر مومن کی زندگی میں مرتسم ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ایک طرف شدت جذبات لیکن اس کے ساتھ دوسری طرف انتہائی ٹھنڈا دماغ۔ ایک طرف عشق کا جنون، دوسری طرف عقل کا اعتدال۔ ایک طرف عزیمانہ خود فراموشی، دوسری طرف حکمت اور تدبر کا حسن احتیاط۔ قرآن اسی قسم کی سیرت کی تعمیر کرتا ہے اور اسی سیرت کی حامل وہ جماعت ہے جسے امت وسطیٰ قرار دیتا ہے، جس کا کام انسانیت کے معاشرہ میں توازن قائم رکھنا اور ناہمواریوں کو ہمواریوں سے بدلنا ہے۔ اسی جماعت کا فقدان آج دنیا کو جہنم بنا رہا ہے اور اسی کا وجود اسے جنت میں تبدیل کر دے گا۔

باقی رہا حسرت موہانی کا مقام شاعری میں، سو جس شخص کا انداز بیان اس قسم کا ہو کہ

جاں نثاروں کو پوچھتے ہیں وہ
تم بھی حسرت اٹھو، سلام کرو

غزل میں اس کا جو مرتبہ ہو سکتا ہے ارباب ذوق کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔

۳۔ بعض لوگوں کو اس پر تعجب ہوا کرتا ہے کہ جو لوگ جھوٹی روایات وضع کیا کرتے تھے وہ لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی میں اسکی جرأت کس طرح کر لیتے تھے۔ لیکن ان کیلئے یہ چیز وجہ استعجاب نہیں رہیگی جب وہ دیکھیں گے کہ لوگ آج بھی افترا پردازی اور بہتان طرازی میں کس طرح بکف چراغ دارشتہ میدان میں آجاتے ہیں۔ طلوعِ اسلام ہر مہینے شائع ہوتا ہے اور سالہا سال سے شائع ہوتا چلا آرہا ہے۔ ہزارہا لوگ اسے ہر مہینے پڑھتے ہیں۔ اس کی کاپیاں ہر جگہ سے مل سکتی ہیں۔ سینکڑوں قارئین کے ہاں اسکی فائلیں تک بھی موجود ہیں۔ یہ جو کچھ لکھتا ہے کھلے کھلے طور پر لکھتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے واضح انداز میں لکھتا ہے۔ اس میں نہ رموز ہوتے ہیں نہ بواطن۔ نہ اس میں کسی سینہ بہ سینہ طریقِ تعلیم و تعلم کو دخل ہے۔ اس کے باوجود دیکھئے کہ لوگ اسکے متعلق کیا کچھ کہتے ہیں۔ قارئین طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ طلوعِ اسلام کے متعلق اسلامی جماعت کے اخبار "کوثر" (لاہور) کی ۱۲ مئی کی اشاعت میں حسبِ ذیل سطور شائع ہوئی ہیں:

> دوسرے وہ لوگ جنھوں نے سرے سے سنت کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ عہدِ حاضر میں "طلوعِ اسلام" کا ملحدانہ مکتبِ خیال اس گروہ کا ترجمان ہے۔ اس نے سرے ہی سے حدیث کا انکار کر دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک ایسے شخص کی حیثیت دے دی جس نے قرآن مجید کو خدا سے پاکر انسانوں کو دیدیا اور نہ پھر اس پر خود عمل کیا اور نہ دوسروں سے عمل کرایا اور نہ جس طریق پر زندگی بسر کی اس کا کوئی حصہ ایسا ہے جس کی پیروی اور اطاعت واجب ہو بلکہ اب جس کے جی میں جو آئے قرآن مجید کے احکام کے معنی نکالے۔ یہانتک کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی بھی کوئی صورت معین نہیں۔ نمازیں خواہ تین ہوں یا ایک یا مجرد دفتروں کی حاضری ہی کو نماز کا قائم مقام تصور کر لیا جائے۔ روزے بھی چند ہی یعنی زیادہ سے زیادہ تین وغیر ذالک من الخرافات۔ اسلامی زندگی کسی معین اور مقرر ضابطۂ حیات کا نام نہیں ہے۔ مسلمان جو کچھ کر لیں بس وہی اسلام ہے۔

ہم قارئین طلوعِ اسلام سے پوچھتے ہیں کہ کیا انھوں نے آج تک طلوعِ اسلام نے کہیں بھی یہ لکھا دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نہ قرآن پر خود عمل کیا، نہ دوسروں سے عمل کرایا جس کے جی میں آئے قرآن کے احکام کے معنی نکالے۔ یہانتک کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، کی کوئی صورت معین نہیں، یا یہ لکھا ہو کہ نمازیں خواہ تین ہوں، خواہ ایک، یا مجرد دفتر کی حاضری ہی کو نماز کا قائم مقام تصور کر لیا جائے۔ یا کسی جگہ یہ لکھا ہو کہ روزے زیادہ سے زیادہ تین ہیں، یا یہ کہ اسلامی زندگی کسی معین اور مقرر ضابطۂ حیات کا نام نہیں۔ مسلمان جو کچھ کرلے بس وہی اسلام ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کتنا بڑا ہے یہ افترا، جو وضع کیا گیا ہے اور کیا سنگین ہے یہ بہتان جو تراشا گیا ہے۔ جسکی تائید میں طلوعِ اسلام کے فائلوں میں سے ایک لفظ بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔

اب ذرا سوچئے کہ آنیوالا مورخ جب ہمارے دور کی تاریخ لکھنے بیٹھے اور اس کے سامنے اخبار "کوثر" کا مذکورہ صدر شذرہ ہو تو اس کے بعد وہ طلوعِ اسلام کے مکتبِ خیال کے متعلق جو رائے بھی قائم کریگا، ظاہر ہے۔ آنیوالوں کیلئے اخبار "کوثر" کی مذکورہ "شہادت" ایک مستند روایت بن جائیگی، بالخصوص جب وہ اس روایت کے راویوں کے متعلق یہ بھی لکھا ہوا دیکھے گا کہ یہ لوگ اپنے آپ کو امت کے صالحین قرار دیتے تھے۔ اس لئے جرح اور تعدیل کے ہر معیار کے مطابق یہ راوی لامحالہ ثقہ قرار پائیں گے، اور روایت بالکل صحیح اور معتبر۔

اب تو آپ کو اس پر تعجب نہیں ہوگا کہ جھوٹی روایتیں کس طرح وضع ہوا کرتی ہیں!

سلیم کے نام ....

پرویز

سلیم! تم جس انداز سے اعتراضات کو استفسارات کے رنگ میں پیش کرتے ہو یہ تمہاری سلامتی قلب کی دلیل ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ "قلب سلیم" بڑی گراں بہا متاع ہے۔ تم اس پر جسقدر بھی ناز کرو، کم ہے۔ اس انقلاب عظیم کے دور میں کہ جسے قرآن نے "قیامت" سے تعبیر کیا ہے اور جو انسانیت کے قیام کا دور ہے، کوئی اور متاع اس قدر گراں بہا نہیں ہوگی الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔ یہی وہ قلب (ذہنیت و نفسیاتی کیفیت) ہے جس کی طرف جنت کی آسودگیاں خود بخود کھنچی چلی آتی ہیں۔ وازلفت الجنۃ للمتقین (۲۶/۸۹-۹۰) تمہاری یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے میں ہزار کام چھوڑ کر بھی تمہارے استفسارات کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے اس سے خوشی ہوتی ہے کہ تم اب رفتہ رفتہ نظام ربوبیت کے اصول و مبانی کو سمجھتے جا رہے ہو۔ اسی سے پورے کا پورا اسلامی نظام سمجھ میں آجائے گا۔

تمہارے پہلے اعتراض (یا استفسار) کا صغریٰ کبریٰ قائم کیا جائے تو مسئلہ کی نوعیت یوں بنتی ہے کہ

(i) خود غرضی انسانی فطرت میں ہے۔

(ii) جو کچھ انسانی فطرت کے مطابق ہے وہ عین اسلام ہے۔

(iii) جو کچھ عین اسلام ہے اس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔

(iv) لہٰذا کوئی ایسا نظام جس میں خود غرضی کی جگہ کلی بہبود کو مقدم رکھا جائے، اسلامی نہیں ہو سکتا۔

اس لئے

نتیجۂ مستخرجہ یہ ہوا کہ نظام ربوبیت، تقاضائے اسلام نہیں ہو سکتا۔

اس استفسار میں تم نے ایک بہت بڑی بات چھیڑ دی ہے جس کا خط و کتابت کے ذریعے سمجھ میں آنا بہت مشکل ہے۔ ایک طرف تو اس لئے کہ یہ مسئلہ بنیادی اور اساسی ہے اور دوسری طرف اس لئے کہ ہمارے ہر اہم مسئلہ کی طرح یہ بھی تہ در تہ غلط فہمیوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اس کا صحیح مقام معارف القرآن کی پانچویں جلد ہے جو اس وقت زیر تسوید ہے۔ لیکن چونکہ تمہاری بیتابی تمنا حریف انتظار و نزبص نہیں ہوا کرتی، اس لئے مجبوراً اسے اسی مقام پر مختصر الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اسے ذرا توجہ سے سمجھنا۔ بات مشکل ہے اور گنجائش بہت کم ــــ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اعتراض کا محرک جذبہ (غیر شعوری طور پر) یہ ہے کہ ہمارے ہاں یہ امور بطور مسلمات مانے جاتے ہیں کہ

(ا) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے۔

(ب) لہٰذا انسان کی فطرت عین خدا کی فطرت ہے۔

(ج) اسلام دین فطرت ہے یعنی عین انسانی فطرت کے مطابق۔

(د) لہٰذا کوئی کام جو انسانی فطرت کے خلاف ہو وہ اسلام کے خلاف ہے۔

اسی بنا پر ہمارے ہاں سب سے بڑا زور اس بات کے ثابت کرنے میں صرف کیا جاتا ہے کہ "اسلام دین فطرت ہے"۔ یہ الفاظ بڑے خوش آئند ہیں اور چونکہ انھیں بطور مسلمات تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے ان پر کسی غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن سلیم! تم میرے مسلک کو جانتے ہو۔ میں ہمیشہ یہ تاکید کیا کرتا ہوں کہ جو الفاظ استعمال کرو، سب سے پہلے ان کا مفہوم متعین کر لو۔ یونہی اندھی تقلید میں الفاظ استعمال نہ کرتے جاؤ۔ "انسانی فطرت"۔ "انسانی فطرت" کے الفاظ صبح سے شام تک سینکڑوں مرتبہ دہرائے جاتے ہیں۔ لیکن تم نے کبھی، سلیم! یہ بھی سوچا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے؟ "انسانی فطرت" کہتے کسے ہیں؟ ذرا سوچکر بتاؤ تو سہی کہ انسانی فطرت سے مفہوم کیا ہے؟ تم جسقدر سوچتے جاؤ گے، خود بخود محسوس کرتے جاؤ گے کہ ان الفاظ کا کوئی واضح مفہوم تمہارے ذہن میں نہیں ہے۔ اور ایک تم پر ہی کیا موقوف ہے۔ دوسرے لوگ بھی جو ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں، ذرا ان سے پوچھ کر دیکھو کہ "انسانی فطرت" کیا ہوتی ہے۔ تم خود دیکھ لوگے کہ وہ بھی تمہاری طرح کورے ہوں گے۔ سلیم! ہمیں اسی چیز نے تباہ کر رکھا ہے۔ جب زندگی کے تصورات، عمل سے بیگانہ ہو جائیں، جب الفاظ محض اصطلاحات اور اعمال محض رسوم بن کر رہ جائیں، جب کلمہ (نظریہ حیات) کو استنتاجی میزان (Pragmatic test) میں نہ تولا جائے، تو الفاظ کا استعمال روزمرہ کی عادت بن جاتا ہے۔ ان کا کوئی متعین مفہوم ذہن میں نہیں ہوتا۔ اسی کیفیت کو قرآن "اسماء سمیتموھا انتم واٰباءکم" سے تعبیر کرتا ہے (یعنی محض الفاظ جو قوم میں متوارث چلے آتے ہیں) اور اسی کو میں "شاعری" کہا کرتا ہوں۔

"انسانی فطرت" کیا ہے؟ یہ سوال ایسا اہم اور مشکل ہے کہ انسانی فکر ابھی تک اس کا جواب متعین نہیں کر پایا۔ مشرق میں تو خیر ان امور کے متعلق غور و خوض اور تحقیق و تدقیق سے کام ہی نہیں لیا جاتا۔ (مشرق نے صدیوں سے سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ تقلید اور بے عملی کی افیون کا یہی خاصہ ہوا کرتا ہے)۔ مغرب میں جہاں ائمہ فکر و خبر نے انسانی نفسیات (Human Psychology) کے متعلق اس قدر تجسس و کاوش سے کام لیا ہے اور نفس انسانی کے امیال و عواطف اور مدرکات و احساسات کی بابت اسقدر ریسرچ کی ہے، وہ بھی اس باب میں کسی حتمی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے کہ "انسان کی فطرت" کیا ہے؟ ان کے ہاں ایک مکتب فکر کا خیال ہے کہ اگر انسان کو خارجی اثرات سے متاثر نہ ہونے دیا جائے تو اس کے بعد وہ جن خصوصیات کا حامل ہوگا انھیں غیر ملوث انسانی فطرت (Un-Adulterated Human nature) ..... کہا جائے گا۔ لیکن یہ نظریہ محض تصور ہی تصور میں

پرورش پاسکتا ہے۔ عملی دنیا میں اس کا وجود نہیں مل سکتا۔

"خارجی اثرات" جو انسان پر اثر انداز ہوتے ہیں، دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(i) وہ اثرات جو انسانی بچہ وراثتاً اپنے ساتھ لاتا ہے اور (ii) وہ اثرات جو اس پر تعلیم و تربیت (ماحول) سے مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہم کسی بچے کو کسی ایسے صحرا یا جنگل میں تنہا چھوڑ دیں جہاں کسی دوسرے انسان کے خیالات اس پر اثر انداز نہ ہوں اور اس کے بعد دیکھیں کہ وہ کن خصوصیات کا حامل بنتا ہے تاکہ ان خصوصیات کو "انسانی فطرت" کے اجزا کہا جا سکے۔ اول تو یہ بھی ناممکن ہے لیکن بفرضِ محال اسے ممکن بھی تصور کر لیا جائے تو ہم ان اثرات کو کہاں لے جائیں گے جنہیں وہ بچہ وراثتاً اپنے ساتھ لایا ہے۔ اس کی "فطرت" کو ان اثرات سے منزہ و معرّی کر دینا محال ہے۔ یہ اثرات تو اس کے خون کے ذرات اور قلب و دماغ کے ریشہ ریشہ میں حلول کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ اگر اس کے ساتھ، ائمہ علم الابدان کے اس نظریہ کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ انسان کے عادات و اطوار، اس کے غدود اور ان غدودوں سے رسنے والی رطوبات سے متشکل ہوتے ہیں، اور یہ غدود اس کی جسمانی ساخت کا لاینفک حصہ ہوتے ہیں جو اسے وراثت میں ملتی ہے، تو انسانی بچہ کو ان عوامل کے اثرات سے غیر متاثر رکھنا یکسر ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا کسی ایسے بچہ کا (عملاً) تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جسے ان عوامل سے الگ تھلگ رکھا جا سکے جن سے اس کی عادات و خصائل اور امیال و عواطف ترتیب پاتے ہیں۔ اور جب یہی ناممکنات سے ہے تو پھر "غیر ملوث انسانی فطرت" کا تعین بھی ناممکن ہے۔

دوسرے مکتب تحقیق کا خیال ہے کہ "انسانی فطرت" کو متعین کرنے کا طریق یہ ہے کہ شروع سے آج تک مختلف ادوار و امصار کے تمام انسانوں کی تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا جائے اور اس طرح جو انسانی خصوصیات، ہر زمانہ اور ہر مقام پر نوعِ انسانی میں مشترک پائی جائیں انہیں الگ کر لیا جائے۔ ان کے مجموعے کا نام "فطرتِ انسانی" ہوگا۔ لیکن غور کیجئے کہ یہ طریق کار جہاں اس قدر ناممکن العمل ہے وہاں کس قدر ناقص بھی ہے۔ تاریخ کیا ہے؟ انسانی دل و دماغ کے معمولات (Activities) کا ریکارڈ! یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ انسانی میلانات و رجحانات کن کن عوامل سے ترتیب پاتے ہیں اور کن کن عناصر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مختلف ادوار کے انسانوں کے معمولات کے اقدار مشترک (Common Factors) کا مجموعہ "انسان کی فطرت اصلیہ" کہلائیگا، خود فریبی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اس طریق عمل سے آج تک کوئی حتمی نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو سکا۔

ایک تیسرا مکتب فکر، علمائے علم الانسان (Anthropologists) پر مشتمل ہے جن کا خیال ہے کہ جب انسان اپنے ابتدائی زمانہ میں سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور تہذیب و تمدن کی حضریاتی زندگی سے ہنوز آشنا تھا۔ اس وقت وہ اپنی اصلی فطرت پر تھا۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ افریقہ کے حبشیوں، امریکہ کے احمر ہندیوں یا آسٹریلیا کے جنگلی باشندوں کی زندگی "فطرتِ انسانی" کی مظہر ہے۔ لیکن اول تو خود ان ائمہ تحقیق کے انکشافات کے مطابق مختلف ممالک کے قدیم (وحشی) انسانوں کے عادات و خصائص

مختلف ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں جو شے قدر مشترک رہ جاتی ہے وہ ان کی جہالت اور توہم پرستی ہے۔ لہٰذا اس نظریہ کی رو سے "جہالت اور توہم پرستی" کے مجموعے کا نام "انسانی فطرت" قرار پا سکے گا۔

بعض علمائے نفسیات کا خیال ہے کہ انسانی بچہ اپنے ابتدائی ایام طفولیت میں "فطرتِ انسانی" سے بہت قریب ہوتا ہے۔ لیکن سلیم! ذرا کسی بچے کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کرو اور پھر دیکھو کہ اس میں کون کون سی خصوصیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ یہی نا! کہ اس کے ہاتھ میں جو کچھ آتا ہے اسے توڑ ڈالتا ہے۔ دوسرے کی چیز کو جھپٹ کر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ نہیں ملتی تو چیختا چلاتا، ضد کرتا ہے۔ دوسرے بچوں کو پیٹتا ہے۔ اگر کسی دوسرے بچے سے پیار کیا جائے تو اس پر حسد کے مارے جل اٹھتا ہے۔ کبھی آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ کبھی منہ میں مرچ ڈال لیتا ہے۔ ہاتھ سے چاقو چھینو تو چیخنے لگ جاتا ہے۔ لہٰذا اس طریقِ فکر کے مطابق "فطرتِ انسانی" کے لاینفک اجزا یہی کچھ قرار پا سکتے ہیں۔

اب سلیم! ان چیزوں کو لو جو عام طور پر تمام انسانوں میں بطور قدر مشترک پائی جاتی ہیں۔ یعنی تحفظ ذات (Preservation of self) اور بقائے نسل کا جذبہ۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان چیزوں کو "انسانی فطرت" قرار دیا جا سکتا ہے؟ انسان کیا ہے؟ حیوان کی ارتقا یافتہ شکل! جس طرح نباتات کی جڑیں زمین میں اور شاخیں فضا کی پنائیوں میں ہوتی ہیں، اسی طرح انسان کی طبعی اصل، حیوانی ہے اور "انسانی اصل" اس سطح سے بلند۔ اس کی طبعی زندگی کا انحصار انہی عوامل پر ہے جن پر دوسرے حیوانوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ سانس لینا، کھانا، پینا، سونا، سردی گرمی کے شدید اثرات سے محفوظ رہنا۔ اسی طرح تحفظ ذات اور بقائے نسل کا جذبہ بھی حیوانی سطح کی چیز ہے۔ یہ جذبہ ہر حیوان میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ جذبہ بھی "انسانی فطرت" نہ ہوا بلکہ "حیوانی فطرت" کا مظہر ٹھہرا۔ جس طرح حیوانات میں یہ چیزیں جبلی طور پر (Instinctively) موجود ہوتی ہیں، اسی طرح یہ چیزیں انسان میں بھی موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ چیزیں انسانی فطرت (Human nature) نہیں بلکہ حیوانی جبلت (Animal instinct) قرار پا سکتی ہیں۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ جو بات بظاہر اس قدر آسان دکھائی دیتی تھی، ذرا سے غور و فکر کے بعد وہ کس قدر مشکل نظر آنے لگی۔ یعنی "انسانی فطرت" اول تو متعین ہی نہیں ہو سکتی، اور اگر وہ متعین ہوتی ہے تو اس کے اجزائے ترکیبی کیا قرار پاتے ہیں؟ جہالت اور توہم پرستی (قدیم زمانہ کے وحشی انسانوں کے خصائص) یا شکست و ریخت، ضد، حسد، غلبہ و استیلا، ناعاقبت اندیشی، اپنے نفع و نقصان سے بھی ناآگہی (بچے کی ابتدائی زندگی کی خصوصیات)۔ سلیم! غور کرو کہ اگر یہی "انسانی فطرت" ہے تو کیا یہ کوئی ایسی چیز ہے جسے باعث عز و شرف قرار دیا جا سکے؟ کیا یہ اس قابل ہے کہ اس کے متعلق کہا جائے کہ

(i) یہ عین خدا کی فطرت (فطرت اللہ) ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اور

(ii) اسلام اسی فطرت کے تقاضے پورے کرنے کا دین ہے۔

سوچو سلیم! کہ یہ سوچنے کی بات ہے!! اور اگر یہ انسانی فطرت نہیں تو بتاؤ وہ کونسی فطرت ہے جو خود اللہ کی فطرت ہے اور جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق دین اسلام ہے؟ اور پھر یہ بھی سوچو کہ اس فطرتِ انسانیہ کا پتہ اور نشان کہاں سے لیا جائے اور اسے متعین کس طرح کیا جائے؟

اب سلیم! ایک قدم آگے بڑھو۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم اکتا تو نہیں گئے؟ بات تم نے چھیڑ دی ہے بہت مشکل اور جو نتائج تمہارے سامنے آرہے ہیں وہ ہیں یکسر غیر مانوس اور غیر متوقع۔ اس لئے اس بحث سے طبیعت کا اکتا جانا مستبعد نہیں۔ لیکن اب یہ کمبل تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ اسے تو آخر تک سننا اور سنکر سمجھنا ہی ہوگا۔

وہ اگلا قدم یہ ہے کہ خود قرآن میں بھی انسان کی بعض خصوصیات کا ذکر آتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان خصوصیات کے مجموعے کو "انسانی فطرت" قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر وہی انسانی فطرت کے اجزاء ہیں تو کیا اس قسم کی فطرت کو "فطرت اللہ" کا مظہر اور اسلام کو اس فطرت کا دین سمجھا جا سکتا ہے؟۔ ان خصوصیات میں سب سے پہلے وہ "خصوصیتِ کبریٰ" ہے جو قصہ آدم کے ضمن میں مذکور ہے اور جس کی طرف ملائکہ یہ کہہ کر اشارہ کرتے ہیں کہ اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفك الدماء (البقرہ) "کیا تو زمین کی جانشینی اس کے سپرد کرے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائیگا"۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے اس اعتراض کی تردید نہیں کی بلکہ صرف اتنا کہا کہ انی اعلم مالا تعلمون "ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے"۔ لہٰذا انسان کی سب سے پہلی خصوصیت "فساد اور خوں ریزی" ہے۔ اور اس کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے کہ یہ خصوصیت فی الواقعہ بلا قیدِ زمان و مکان، عمومی طور پر انسانوں میں قدر مشترک کہلا سکتی ہے۔

پھر قرآن کریم میں انسان کے متعلق ہے کہ یہ بڑا جھگڑالو ہے (وکان الانسان اکثر شیٔ جدلا (۱۸/۵۴) خصیم مبین ہے (۳۶/۷۷) "ظلوم و جہول" ہے (۳۳/۷۲) ہلوعا ہے (یعنی ایسا جس کی نیت ہی نہیں بھرتی۔ ۷۰/۱۹) ناشکرا ہے (۱۰۰/۶) خیر کی جگہ شر کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے۔ (۱۷/۱۱) جلد باز ہے (۱۷/۱۱)۔ وغیرہ۔

تم نے غور کیا ہے سلیم! کہ یہ کونسی خصوصیات ہیں؟ کیا یہ وہی خصوصیات نہیں جو بچے کی ابتدائی زندگی یا دنیا کی وحشی اقوام میں پائی جاتی ہیں؟ یعنی وہ خصوصیات جن کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب انسان کو "علی حالہ" چھوڑ دیا جائے (علیٰ حالہ کی تشریح ذرا آگے چل کر آتی ہے)۔ اگر یہ خصوصیات "انسان کی فطرتِ اصلیہ" کی مظاہر ہیں تو انہیں "فطرت اللہ" کا مظہر کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہ خصوصیات کم از کم اس خدا کی "فطرت" تو کسی طرح بھی قرار نہیں دی جا سکتیں جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے اور نہ ہی اسلام، اس "فطرت" کا دین قرار دیا جا سکتا ہے؟

تم جی میں کہتے تو ہوگے سلیم! کہ میں نے بات کیا پوچھی اور سلسلۂ کلام کس طرف چل نکلا؟ لیکن اس کے بغیر بات سمجھ میں ہی نہیں

آسکتی۔ اس تمہید کے بعد سلیم! اس آیتِ جلیلہ کو سامنے لاؤ جسے اس مسلمہ کے لئے بطور سند پیش کیا جاتا ہے کہ

(i) انسان کو اللہ نے اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ اس لئے انسانی فطرت، فطرت اللہ کی مظہر ہے۔ اور

(ii) اسلام دین فطرت ہے۔

وہ آیت یہ ہے۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا۔ لا تبدیل لخلق اللہ۔ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون (۳۰/۳۰)۔ اور اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہ دین قیم (اسلام) ہے لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے"۔ اور اس سے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ انسان کی فطرت، فطرت اللہ پر متفرع ہے۔ یعنی جو اللہ کی فطرت ہے وہی انسان کی فطرت ہے اور اسلام اس فطرت کے مطابق دین ہے۔

ذرا سوچو سلیم! کہ اگر اس آیت کا یہی مفہوم لیا جائے تو بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانی کوششیں فطرت انسانیہ کے تعین میں یکسر ناکام ہیں۔ باقی رہا قرآن کریم، سو اس میں انسان کی جن خصوصیات کا عمومی طور پر ذکر ہے وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ انہیں "فطرت اللہ" قرار دیا جائے یا اس "فطرت" پر فخر کیا جا سکے۔ (یہ یاد رکھو کہ ذکر مومنین کی صفات کا نہیں بلکہ انسان کی فطرت کا ہو رہا ہے)۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ "فطرت" کا یہ مفہوم ہی غیر قرآنی ہے۔ قرآن نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال ہی نہیں کیا جس معنی میں یہ آج مستعمل ہے۔ قرآن اس عربی مبین میں نازل ہوا جو عہد نزولِ قرآن میں عربوں کی زبان تھی۔ اُس زمانے کے عربوں میں (جو بالعموم بدوی زندگی بسر کرتے تھے) فلسفہ، مابعد الطبیعیات، تصوف یا ایتھکس کی اصطلاحات رائج ہی نہ تھیں (بدو تو ایک طرف اُس زمانے کے شہری زندگی بسر کرنے والے عرب بھی ان اصطلاحات سے ناآشنا تھے)۔ یہ اصطلاحات بہت بعد کے زمانے کی اختراعات ہیں۔ یا کم از کم عربی زبان میں ان کا عمل دخل بہت بعد میں ہوا ہے۔ یعنی اس زمانے میں جب عربوں کی سادہ زندگی کی جگہ عجمی تصورات حیات نے لے لی اور اس طرح ان کی زبان (عربی مبین) کے سیدھے سادے الفاظ، عجمی نظریات کے اصطلاحی مفہوم کے لئے استعمال ہونے لگے۔

یاد رکھو سلیم! جب کوئی قوم سیدھی سادی زندگی بسر کر رہی ہو تو اس کی زبان کے الفاظ ٹھوس اشیا (Concrete things) کا مفہوم ادا کریں گے، مجرد[1] گفتگو (Abstract talk) کے لئے وہ استعمال نہیں ہوں گے کیونکہ سیدھی سادی زندگی

---

[1] خود اسی لفظ مجرد کو لو۔ اس کا مادہ جرد ہے۔ جراد ٹڈی (Locust) کو کہتے ہیں۔ جب مسلمانوں کے معاشرہ میں علمی نظریات دخیل ہوئے تو اس لفظ کے مفہوم میں وسعت آنی شروع ہو گئی۔ "ٹڈی دل کا خاصہ ہے کہ وہ درختوں کو "ٹنڈ منڈ" کر دیتی ہے۔ اس لئے مجرد کے معنی ہو گئے تنہا بلا اہل و عیال۔ تجرید کے معنی ہوئے حشو و زوائد اور مکررات سے پاک کرنا۔ اس کے بعد جب اس معاشرہ میں علم الکلام اور تصوف آیا تو تجرید کے معنی ہو گئے (Abstract) یعنی تمام ٹھوس صفات سے منزہ۔ قرآن کا مفہوم سمجھنے کیلئے ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ نزولِ قرآن کے زمانے میں قرآن کے الفاظ (عربی مبین) کا کیا مفہوم لیا جاتا تھا۔ بعد میں وہ الفاظ جن اصطلاحی معنوں میں استعمال ہونے لگ گئے، ضروری نہیں کہ قرآن کا بھی وہی مفہوم ہو۔ ہمارے ہاں قرآنی الفاظ کا جو مفہوم مروج ہے وہ عام طور پر وہ اصطلاحی مفہوم ہے جو اس وقت متعین ہوا جب اسلام پر عجمی تصورات غالب آ گئے تھے۔ لہٰذا آج کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ کے وہ معانی معلوم کئے جائیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں مروج تھے اور ان معانی کی روشنی میں دورِ حاضرہ کی علمی سطح کے مطابق قرآنی مفہوم کو از سرِ نو سمجھا جائے۔

بسر کرنے والی قوم، مجرد گفتگو سے ناآشنا ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں اسوقت قرآن کا جو مفہوم مروج ہے وہ ان اصطلاحات کی رو سے متعین کیا گیا تھا جب اسلام پر عجمی تصورات چھا گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس مفہوم سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص دور میں قرآن کو اس طرح سے سمجھا گیا تھا۔ لیکن ہم نے اسی مفہوم کو "قرآن" سمجھ لیا اور اس طرح ایک خاص دور کا مفہوم، ازلی، ابدی اور غیر متبدل تصور کر لیا گیا۔ جب تک ہم اس بنیادی غلطی سے نہیں نکلتے، قرآن ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہاں کے تمام الجھاؤ اسی غلط فہمی کے پیدا کردہ ہیں۔ اسی سے وہ تمام اختلافات پیدا ہوتے ہیں جو ہمارے لئے اسدرجہ پریشانی فکر و نظر کا باعث بن رہے ہیں۔ یعنی ہم نے انسانی تعبیرات کو خدا کا ازلی قرآن سمجھ رکھا ہے اور چونکہ انسانی تعبیرات میں اختلاف ناگزیر ہے اس لئے ہمارے ہاں خود "قرآن" میں اختلاف محسوس ہو رہا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کے اس اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کرلیں جو خاص خاص ادوار کا پیدا کردہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے وہ معانی متعین کریں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے۔ اور ان معانی کی روشنی میں اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق، قرآن کا مفہوم از سر نو متعین کریں۔ جب تک ہم قرآنی الفاظ کے ماخذ (Origin) تک نہیں پہنچیں گے اور بعد کے اصطلاحی مفہوم ہی کو ازلی اور ابدی سمجھتے رہیں گے، قرآنی مطالب ہماری نگاہوں سے اوجھل رہیں گے۔

ہمارے ہاں لفظ فطرت کا ترجمہ نیچر (Nature) کیا جاتا ہے۔ لفظ نیچر کا مفہوم بہت وسیع ہے علم طبیعیات (Physics) میں نیچر، عالمِ آفاق کو کہتے ہیں اور اس سے متعلقہ قوانین کو قوانینِ فطرت (Laws of Nature) ما بعد الطبیعیات، (Meta physics) میں اس سے مراد اُس قوت سے ہوتی ہے جو کائنات کو چلا رہی ہے۔ فلسفہ میں اس کا مفہوم کسی شے کی وہ خصوصیت ہے جس سے وہ شے دیگر اشیاء سے ممیز ہوتی ہے۔ علم النفس کی رو سے نیچر، جبلی استعداد، یا قلبی رجحانات و میلانات کو کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ یہ لفظ (نیچر) انگریزی زبان میں متعدد دیگر معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی سے پہلے خود ہمارے ہاں کے متکلمین اور حکماء کے ہاں لفظ فطرت انہی اصطلاحی معانی میں استعمال ہوتا تھا۔ لفظ فطرت کے یہی معانی اس وقت ہمارے ہاں رائج ہیں اور چونکہ یہ معانی ایک عرصہ سے مروج چلے آرہے ہیں اس لئے یہ ہمارے قلب و دماغ میں اس طرح پیوست ہو چکے ہیں کہ ادھر لفظ فطرت ہمارے کانوں میں پڑا اور ادھر بلا کدو کاوش، اس کا ایک خاص مفہوم ہمارے سامنے آگیا۔ "اس شخص کی فطرت ہی ایسی ہے"۔ "وہ فطرۃً اس قسم کا واقعہ ہوا ہے" "انسانی فطرت کا خاصہ ہے"۔ یہ فقرے ہماری روزمرہ کی زبان میں داخل ہیں اور ان سے لفظ فطرت کا ایک خاص مفہوم ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ یہی الفاظ بولتے بولتے جب ہمارے سامنے قرآنی آیت میں "فطرت اللہ" کے الفاظ آتے ہیں تو اس سے وہی مفہوم ہمارے سامنے آجاتا ہے جس سے ہمارا ذہن اس درجہ مانوس ہو چکا ہے اور اسی مفہوم کے مطابق ہم قرآنی آیت کا مفہوم متعین کر لیتے ہیں اور پھر "اللہ کی فطرت جس پر انسانی فطرت[1]

[1] "خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے"۔ یہ تصور درحقیقت یہود سے مستعار لیا گیا ہے جن کے ہاں (توریت کی رو سے) عقیدہ یہ ہے کہ "خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا"۔

متفرع ہے"۔ کو بطور ایک حقیقتِ ثابتہ پیش کر دیتے ہیں اور اسلام کو دینِ فطرت قرار دیدیتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس لفظ فطرت کا وہ مفہوم جو اس وقت ہمارے ذہنوں میں پیوست ہے، کیا قرآن میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم کے لئے استعمال ہوا ہے؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، لفظ فطرت کا موجودہ مفہوم بعد کے زمانے کا ہے جب یونان کا فلسفہ عربی میں منتقل ہوا اور لفظ نیچر کا ترجمہ "فطرت" کیا گیا۔ لفظِ فطر کے اصل معنی کسی چیز کو پھاڑنا، شگاف دینا ہیں۔ "فُطر" نباتات کو کہتے ہیں جو زمین پھاڑ کر اُگتی ہے۔ لہٰذا اس سے مراد ہے کسی شے کو پھاڑ کر اس میں سے کسی نئی چیز کو پیدا کرنا۔ تخلیق، ایجاد، ابداع (To Create; Originate)۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لئے آیا ہے فاطر السمٰوٰت والارض (پستیوں اور بلندیوں کا پیدا کرنے والا)۔ لہٰذا "فطرت اللہ" کے معنی (Nature of God) نہیں بلکہ خدا کا قانونِ تخلیق ہے۔ اسی قانونِ تخلیق کے مطابق اس نے عالمِ آفاق کو پیدا کیا (الذی فطر السمٰوٰت والارض) اور اسی کے مطابق انسان کو (قل الذی فطرکم اول مرہ) لہٰذا فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا کے معنی ہوئے "اللہ کا وہ قانونِ تخلیق جس کے مطابق اس نے انسان کو پیدا کیا ہے"۔ وہی قانونِ تخلیق جس کے مطابق عالمِ آفاق وجود میں آیا ہے۔ یہ قانونِ تخلیق (یا نظامِ فطرت) کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس قانون کی رو سے کائنات کی ہر شے میں کچھ امکانی وسعتیں (Potentialities) رکھ دی گئی ہیں جن کی نمود و تکمیل اس شے کی زندگی کی غائت ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر بھی کچھ صلاحیتیں مضمر ہیں۔ ان صلاحیتوں کی کامل نشوونما انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ عالمِ آفاق اور عالمِ انسان میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر کی صورت میں، نشوونما کا قانون، ان اشیاء پر مسلط کر دیا گیا ہے اور وہ بلا اختیار و ارادہ اس قانون کی پابندی کرتی ہیں۔ انھیں اس امر کا اختیار نہیں کہ چاہیں تو اس قانون کی پابندی کریں اور چاہیں تو اس سے سرکشی اختیار کر لیں۔ ان کے برعکس، انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے اس پر کوئی قانون مسلط کر کے نہیں رکھ دیا گیا۔ یعنی کوئی قانون ایسا نہیں جو اس کی "فطرت" کے اندر رکھ دیا گیا ہو اور یہ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ حتیٰ کہ اس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جبلی پابندیاں جو اس میں حیوانی زندگی سے منتقل ہو کر آتی ہیں، یہ ان کی اتباع پر بھی مجبور نہیں۔ بکری کا بچہ بھوک سے مر جائے گا لیکن کبھی گوشت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ مرغی کا بچہ انڈے سے نکلتے ہی خشکی کی طرف دوڑے گا اور بطخ کا بچہ پانی کی طرف۔ لیکن انسان کے بچے کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی بھی اسی بے تکلفی سے منہ میں ڈال لیتا ہے جس طرح مصری کا ٹکڑا۔ وہ کبھی پانی میں جا گرتا ہے کبھی آگ کے شعلے کو پکڑ لیتا ہے) اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے اندر کوئی چیز ایسی نہیں جو اسے صحیح راستے پر چلنے کے لئے مجبور کر دے۔ اسلئے انسان خارجی راہنمائی کا محتاج ہے۔ یہ خارجی راہ نمائی وحی کے ذریعے ملتی ہے۔ فاما یاتینکم منی ھدیً فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون (۲/۳۸) انسانوں کی طرف من جانب اللہ ہدایت آتی رہے گی۔ جو شخص یا قوم بھی اس راہ نمائی کی اتباع کریگی اسے نہ خوف ہوگا نہ حزن۔ اس ہدایتِ خداوندی کے مجموعے کا نام ہے قرآن۔

یہیں سے سلیم! ایک اور اہم بات بھی نکلتی ہے۔ [لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ تم کہیں اس موضوع کی "نبوت" سے گھبرا نہ جاؤ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس مرتبہ تم نے بات بڑی مشکل چھیڑ دی ہے۔ لیکن اگر تم نے ذرا ضبط اور صبر سے، ذہن پر زور دیکر بات کو سمجھ لیا تو اس کے بعد تمہاری راہ کے بہت سے کانٹے صاف ہو جائیں گے۔] وہ نئی بات کیا ہے؟ ذرا غور سے سنو۔ تم دیکھ چکے ہو کہ یہ تصور کہ انسان کی فطرت، خدا کی فطرت ہے، قرآنی تصور نہیں ہے۔ اسی سے ملتا جلتا (بلکہ اسی پر متفرع) یہ تصور بھی ہمارے ہاں عام طور پر مسلمہ مانا جاتا ہے کہ نیکی اور بدی کی تمیز خود فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے۔ یہ تصور بھی بوجوہ غلط ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت اپنی اصلی حالت پر ہو اور وہ خارجی اثرات سے ملوث نہ ہو چکی ہو تو وہ نیکی اور بدی میں از خود تمیز کر لیتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابھی تک یہی متعین نہیں ہو سکا کہ انسانی فطرت ہے کیا؟ پھر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ایسی "فطرت" کا ملنا ناممکنات سے ہے جو خارجی اثرات (وراثت و ماحول) سے غیر متاثر ہو (میں اس وقت سلیم! حضرات انبیاء کرام کا ذکر نہیں کر رہا، عام انسانوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ نبوت کی حقیقت کا سمجھنا ہمارے حیطۂ ادراک سے باہر ہے)۔ لہٰذا بات یوں ہوئی کہ

(i) نیکی اور بدی کا علم غیر ملوث انسانی فطرت کے اندر مضمر ہے۔

(ii) لیکن غیر ملوث انسانی فطرت کہیں نہیں مل سکتی۔

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس "فطرت" کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دینے سے فائدہ کیا ہوا جس "فطرت" کا کہیں وجود ہی نظر نہیں آتا؟ یاد رکھو سلیم! نیکی اور بدی کا علم "فطرتِ انسانی" کے اندر نہیں۔ اس کا علم وحی کے ذریعے ہو سکتا ہے اور وحی قرآن کے اندر ہے۔ اگر نیکی اور بدی کا علم انسان کی فطرت میں ہوتا تو انسان کو اس کی فطرت کے اتباع کا حکم دیا جاتا۔ لیکن حکم وحی کے اتباع کا ہے، انسانی فطرت کے اتباع کا نہیں۔ وحی کے اتباع سے نفس انسانی کی نشوونما تقاضا ہوتی ہے۔ اور جس طرح مریض کو صحت اور توانائی سے ایک خاص سکون، اطمینان اور مسرت حاصل ہوتی ہے اسی طرح نظامِ وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو ایک خاص آسودگی اور طمانیت کی جنت حاصل ہو جاتی ہے جس سے وہ محسوس کرتا ہے کہ ان احکام کی اتباع، کوئی بیگار نہیں بلکہ اسی طرح باعثِ تسکین ہے جس طرح پیاسے کیلئے ٹھنڈا پانی۔ لہٰذا ان احکام کی اتباع اس کی بالیدگیٔ نفس کا ذریعہ اور مقصودِ حیات ہے [اگر اسے اصطلاح میں "انسانی فطرت" کہہ دیا جائے تو پھر یہ کہا جا سکے گا کہ "اسلام دینِ فطرت" ہے۔ لیکن اس طرح اس کا مفہوم، اس مفہوم سے بالکل الگ ہو گا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے]

انسانی اختیار و ارادہ ہی کا کرشمہ ہے کہ اس میں تعمیر و تخریب دونوں کی صلاحیت موجود ہے۔ (دنیا میں کوئی جانور خودکشی نہیں کر سکتا۔ یہ "شرف" بھی حضرتِ انسان ہی کو حاصل ہے)۔ اسی تخریب و تعمیر کو قرآن نے "فجور و تقویٰ" (Integration and Disintegration) سے تعبیر کیا ہے۔ "والنفس وما سوّٰھا" نفسِ انسانی اور اسے ہموار رکھنے والی قوتیں اس پر شاہد ہیں" کہ "فالھمھا فجورھا وتقوٰھا" اس میں فجور و تقویٰ کے امکانات ودیعت کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔ "قد افلح من زکّٰھا" جس نے اس کی

بالیدگی کا سامان بہم پہنچایا۔ اس کی کھیتی بار آور ہوگئی" وقد خاب من دسّٰہا "جس نے اس کی بالیدگی کی قوتوں کو دبا دیا، وہ تباہ ہوگیا۔" لہٰذا نیکی اور بدی کی تمیز انسان کی فطرت کے اندر نہیں۔ صرف نیکی اور بدی (یعنی نفسِ انسانی کی تکمیل و تخریب) کے امکانات اس کے اندر موجود ہیں۔ ان امکانات کو صحیح طور پر بروئے کار لانے کا طریق کیا ہے؟ اس کے لئے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

بات یہاں تک پہنچ چکی ہے سلیم! کہ

(۱) خدا کا تخلیقی قانون (فطرت اللہ) کائنات اور انسان دونوں میں کارفرما ہے۔

(۲) اس فرق کے ساتھ کہ کائنات کی کسی شے کو اختیار نہیں کہ وہ قانونِ خداوندی سے انحراف کر سکے (اسے تقدیر کی پابندی کہتے ہیں)۔

(۳) انسان کے اندر اسکی ذات کی نشوونما اور تکمیل کی صلاحیت بھی رکھدی گئی ہے، اور اسے تباہ و برباد کر دینے کی امکانی استعداد بھی۔

(۴) انسان کی نشوونما اس نظام کے اندر ہوتی ہے جو ہدایتِ خداوندی کی رو سے متشکل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر نظام اس کی تباہی کا موجب ہوتا ہے۔

(۷) انسان کو اختیار حاصل ہے کہ چاہے بالیدگی اور ارتقار کی راہ اختیار کرلے اور چاہے بربادی اور تباہی کے عمیق غاروں کی طرف چلا جائے۔

جب انسان، نظامِ خداوندی کے بجائے دوسری راہیں اختیار کر لیتا ہے تو اسے "اتباعِ ہوٰی" کہتے ہیں۔ یعنی نیچے کی طرف لے جانے والی قوتوں کی اتباع" تنہا عقل کی اتباع۔ اپنے اپنے جذبات کی اتباع۔ انفرادی مصالح کی اتباع۔ اس روشِ زندگی سے وہ خصوصیات ابھر کر سامنے آجاتی ہیں جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یعنی شکست و ریخت۔ فتنہ و فساد۔ ناہمواریاں اور نا استواریاں۔ جنگ و جدل۔ ظلم و جہول۔ کفران و ھلوعت" خود غرضی اور مفاد پرستی۔ وغیرہ۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ "فطرتِ انسانی" کے مظاہر نہیں بلکہ اس روشِ زندگی کے نتائج ہیں جسے انسان وحی کی روشنی کو چھوڑ کر تنہا عقل کی رو سے اختیار کرتا ہے۔ یعنی اگر انسان کو وحی کی روشنی کے بغیر "علی حالہ" چھوڑ دیا جائے تو اس سے اسی قسم کی خصوصیات کا ظہور ہوگا۔

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم! سورۂ روم کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے جو "فطرت اللہ"۔ "انسانی فطرت"۔ اور "دینِ فطرت" کے تصورات کی بنیاد قرار دی جاتی ہے۔ سلسلہ کلام یوں ہے:-

بل اتبع الذین ظلموا اھواءھم بغیر علم۔ فمن یھدی من اضل اللہ۔ وما لھم من نصرین۔ (۳۰/۲۹)

جو لوگ ہر شے کو اس کے اصلی مقام پر نہیں رکھتے ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ علم (وحی) کو چھوڑ کر اپنے جذبات کی اتباع کرتے ہیں اور اس طرح زندگی کی صحیح راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ یوں بھٹکنے والوں کو کون صحیح راہ پر لا سکتا ہے؟ ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہو سکتا۔

ان کے برعکس صحیح راہِ حیات پر چلنے کی آرزو رکھنے والوں سے کہا گیا کہ

فاقم وجھک للدین حنیفاً۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا۔ لا تبدیل لخلق اللہ[1]۔ ذالک
الدین القیم۔ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔ (۳۰/۳۰)

تم ہر دوسرے ضابطۂ حیات سے منہ موڑ کر اس ضابطہ (الدین) کو اپنا نصب العین بناؤ جو اللہ کے تخلیقی قانون کا تقاضا ہے۔
وہ قانون جس کی رو سے انسان کی خلقت عمل میں آئی ہے، یہ تخلیقی قانون نتائج غیر متبدل ہے۔ یہی وہ ضابطہ حیات ہے جو
خود بھی محکم ہے اور وجۂ قیام انسانیت بھی۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔

یہ ضابطہ حیات (الدین) کیا ہے؟

منیبین الیہ۔ واتقوہ۔ واقیموا الصلوٰۃ۔ ولا تکونوا من المشرکین۔ من الذین فرقوا دینھم وکانوا
شیعاً۔ کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۰/۳۱-۳۲)

سفر زندگی میں ہر قدم اس کی طرف اٹھے۔ اس کے قوانین سے کامل ہم آہنگی ہو۔ نظام صلوٰۃ سے اپنی وحدت کو قائم رکھا جائے
اور دین میں تفرقہ انگیزی پیدا کر کے مشرکانہ مسلک نہ اختیار کر لیا جائے۔ تفرقہ شرک ہے جس میں قانون خداوندی کو
معیار حق و باطل تسلیم کرنے کے بجائے ہر گروہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ برسر حق ہے اور یوں اس فریب نفس میں مگن رہتا ہے۔

غور کیا تم نے سلیم الصحیح راہ یہ ہے کہ سفر زندگی میں انسان کا ہر قدم ضابطۂ خداوندی کے مطابق اٹھے۔ نہ یہ کہ تنہا عقل (یا جذبات) کی اتباع
میں، ناقۂ بے زمام کی طرح، جدھر منہ اٹھا چل دیئے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنے معاشرتی نظام کو ضابطہ خداوندی کی
بنیادوں پر تشکیل کر لیں۔ یہی بلندیوں کی راہ ہے۔ ولو شئنا لرفعنہ بھا۔ (ہمارا قانون مشیت یہ ہے کہ قرآن کے مطابق چلنے سے بلندیاں حاصل
ہوتی ہیں) ولکنہ اخلد الی الارض واتبع ھوٰہ (لیکن اپنے جذبات کی اتباع کرنے والا پستیوں کی طرف جانا چاہتا ہے۔ اس کا
کیا علاج؟ ۱۷۶/۷)۔ لیکن یہ بلندیاں، نظام ربوبیت کے قیام کے بغیر ناممکن ہیں۔ دیکھو قرآن کس قدر واضح الفاظ میں اس حقیقت کی
صراحت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:-

ان سعیکم لشتیٰ - انسانی کوششوں کے رخ مختلف ہوتے ہیں لیکن دیکھو کونسا رخ کس منزل کی طرف لے جاتا ہے۔
فاما من اعطیٰ واتقیٰ - خود دیتا ہے اور قانون ربوبیت سے ہم آہنگی اختیار کر لیتا ہے۔
وصدق بالحسنیٰ - اور اس طرح معاشرہ میں صحیح توازن و تناسب قائم رکھنے کے دعوے کو سچ کر دکھاتا ہے۔
فسنیسرہٗ للیسریٰ - تو اس کے لئے کشادگی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔
واما من بخل واستغنیٰ - لیکن جو مال کو روک رکھتا ہے اور اپنے آپ کو خود مکتفی سمجھ کر اجتماعی نظام سے مستغنی ہو بیٹھتا ہے۔
وکذب بالحسنیٰ - اور اس طرح معاشرہ کے توازن کی عملی تکذیب کرتا ہے۔

[1] لفظ خلق اللہ نے "فطرت اللہ" کے معنی خود واضح کر دیئے ہیں، یعنی خدا کا قانونِ تخلیق۔

فسنیسرہ للعسریٰ۔ تو اس کے لئے عسرت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

ما یغنی عنہ مالہ اذا تردیٰ۔ جب معاشرہ کا توازن بگڑنے سے تباہی آتی ہے تو اس کا انفرادی مال و متاع اسے اس تباہی سے بچا نہیں سکتا۔ (۹۲/۵-۱۰)

اس تمہید کے بعد سلیم! اب تم آؤ اپنے اعتراض کی طرف۔ تم کہتے ہو کہ جب خود غرضی "انسانی فطرت" کا تقاضا ہے تو پھر کوئی ایسا اقدام جو اس خود غرضی کی جگہ کلی مفاد کی طرف لے جائے "خلافِ فطرت" ہو گا۔ جہانتک "فطرت" کا سوال ہے امید ہے کہ گذشتہ تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہو گی۔ اب لو اس تقاضا کو۔ میں یہ بھی لکھ چکا ہوں کہ انسان، حیوان ہی کی ایک ارتقاپذیر شکل ہے۔ اسلئے انسان اور حیوان میں چند اقدار مشترک ہیں۔ اگر ان اقدار مشترکہ کو سمٹا کر کم از کم درجے تک لیجائیں تو نظر آئیگا کہ تحفظِ ذات اور افزائش نسل، دو نمایاں خصوصیات ہیں جو حیوانات اور انسان دونوں میں موجود ہیں۔ جہانتک تحفظِ ذات کا تعلق ہے میں اپنے پچھلے خط میں بتا چکا ہوں کہ حیوان اپنی وقتی ضروریات کے پورا ہو جانے کے بعد مطمئن ہو جاتا ہے، لیکن انسان، وقتی ضروریات کے بعد بھی بہت کچھ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے۔ اسی طرح افزائش نسل کے جذبہ کو لیجئے۔ حیوانات میں جنسی اختلاط محض افزائش نسل کی خاطر ہوتا ہے اور اس کیلئے خدا کے تخلیقی قانون نے ان پر ایسی پابندی عائد کر رکھی ہے جس سے سرکشی ممکن نہیں۔ حیوانات کے جوڑے ہر وقت ساتھ ساتھ پھرتے رہتے ہیں لیکن جنسی قوتوں کی موجودگی کے باوصف، انہیں جنسی اختلاط کا خیال ہر وقت دامنگیر نہیں رہتا۔ یہ جذبہ اسی وقت روبہ کار آتا ہے جب افزائشِ نسل کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، انسان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے جس وقت جی چاہے جنسی اختلاط میں مشغول ہو سکتا ہے۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ (تحفظِ ذات اور افزائش نسل کے) ان دونوں بنیادی تقاضوں میں حیوان اور انسان میں کس قدر فرق ہے۔ انسان، اس باب میں کسی "اندرونی قاعدے" کی رو سے مجبور نہیں، بلکہ اسے اختیار حاصل ہے کہ ان تقاضوں کو جس طرح جی چاہے پورا کرے۔ لیکن انسان تمدنی زندگی (Social life) بسر کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد کا کوئی ایک عمل دوسرے افراد کو بھی متاثر کرتا ہے، اسلئے انسانی اختیار و ارادہ کو بلا حدود و قیود نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے اختیار کو صحیح سواحل . . . (Channels) میں مقید رکھنے کے لئے وحی کی رو سے تحدید کی گئی ہے۔ اگر "افزائش نسل" کی قوتوں پر تحدید عائد نہ کی جائے تو انسانی معاشرہ میں جنسی نوضویت (Sexual anarchy) پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اگر تحفظ ذات کے جذبہ کو بے زمام چھوڑ دیا جائے تو اس سے معاشی فساد (ناہمواریاں) نمودار ہو جاتی ہیں۔ تحفظِ ذات کے جذبہ کو بے لگام چھوڑ دینے کا نام "خود غرضی" ہے۔ ہدایت خداوندی کی رو سے عائد کردہ تحدیدات، افزائش نسل اور تحفظ ذات کے تقاضوں کی تسکین کا انتظام بطریق احسن کر دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی انسانی معاشرہ کو ان ناہمواریوں سے بچا لیتی ہیں جو ان جذبات کو بلا تحدید چھوڑ دینے سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔

اب سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ خود غرضی "فطرتِ انسانی" کا تقاضا نہیں بلکہ تحفظِ ذات کے حیوانی کا (اور انسانی) تقاضا کو ذاتی جذبات (یا تنہا عقل) کے مطابق پورا کرنے کی کوشش بے مہار کا نام ہے۔ تنہا عقل (یا ذاتی جذبات) انفرادی تحفظِ ذات کی اندھی کوششوں میں کلی مفادِ انسانیت کو پسِ پشت ڈال دیتی ہے اور وحی کی رو سے متعین کردہ نظام، تحفظِ ذات کا ایسا انتظام کرتا ہے جس میں تمام نوعِ انسان کی پرورش اور ہر فرد کی امکانی صلاحیتوں کا نشوونما (یعنی تکمیلِ ذات) بطریقِ احسن ہو جائے۔ اس کا نام نظامِ ربوبیت ہے۔ پھر سن رکھو سلیم! کہ مقصودِ حیات صرف طبعی زندگی کی پرورش نہیں۔ اگر مقصود یہی ہوتا تو انسان کو حیوانی سطح سے بلند کیا ہی نہ جاتا۔ یہ حقیقت کہ انسان، حیوانی سطح سے بلند ہے اس امر کی واضح دلیل ہے کہ مقصودِ حیات طبعی زندگی کی پرورش سے زیادہ ہے۔ اسی کا نام انسانی صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہے۔ اور اس کا انتظام نظامِ ربوبیت کی رو سے ہوتا ہے جس کا ضابطہ قرآن ہے۔

اب سلیم! تمہارا دوسرا اعتراض سامنے آتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کچھ زیادہ تگ و تاز بھی نہیں کرتا لیکن یونہی کچھ "اتفاق" ایسا ہو جاتا ہے کہ اسے بے شمار دولت مل جاتی ہے۔ چونکہ اس قسم کے "اتفاقات" (Chances) کی کوئی منطقی توجیہہ سمجھ میں نہیں آتی، اس لئے اس سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ایسا خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جب خدا کا منشاء یہ ہے کہ اس شخص کو اس قدر فراواں دولت دیدی جائے تو اس پر تحدید منشائے خداوندی کے خلاف ہوگی۔

تمہارا یہ اعتراض بھی سلیم! بہت سی بنیادی غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔ تم نے "اتفاق" (Chance) کا ذکر کر کے "تقدیر" کا مسئلہ چھیڑ دیا اور تم جانتے ہو کہ یہ مسئلہ ایسا نہیں جو خطوں میں طے ہو جائے۔ بایں ہمہ، جہاں تک تمہارے زیرِ نظر اعتراض کا تعلق ہے، اس کے متعلق مختصراً اس خط میں لکھنا مناسب ہے۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ہماری کائنات کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ عالمِ آفاق (یعنی انسانوں کی دنیا کے علاوہ باقی ساری کائنات) اور دوسرا حصہ، انسانی دنیا۔ اگر سلیم! تم اس بنیادی فرق کو پیشِ نظر رکھو تو مسئلہ تقدیر کی بہت سی پیچیدگیاں خود بخود حل ہو جائیں گی۔ عالمِ آفاق میں خدا کا قانون از خود کارفرما ہے اور کسی کو اس سے سرتابی کی مجال نہیں۔ کل لہ قانتون۔ لیکن انسان کو صاحبِ ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اپنی مملکت میں آپ صاحبِ اختیار ہے۔ لیکن جس طرح عالمِ آفاق کی نشوونما ربوبیت ایک قانون کے تابع ہوتی ہے اسی طرح عالمِ انسانی کی نمودوارتقا بھی ایک نظام کے ماتحت کارفرما ہوتی ہے۔ عالمِ آفاق میں ہر شے کو اس قانون کی پابندی طوعاً و کرہاً کرنی پڑتی ہے، اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ "تقدیر" کے پابند ہیں۔ یعنی ان اندازوں کے پابند جو ان کی نقل و حرکت اور نشوونما کے لئے مقرر ہیں اور جن سے انھیں کسی صورت میں بھی مفر نہیں۔ اس کے برعکس عالمِ انسانیت میں قانونِ ہدایتِ خداوندی کی شکل میں موجود رہتا ہے، لیکن انسان کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس پر عمل کرے یا نہ کرے۔ بالفاظِ دیگر اشیائے کائنات تخلیقی

قانون کی پابندی مجبوراً کرتی ہیں، جو ان کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن انسان قانونِ خداوندی کی پابندی اپنے اختیار سے کرتا ہے جو اسے انبیاء کی وساطت سے ملتا ہے۔ بقول اقبالؔ

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اب آگے بڑھو۔ انسانی زندگی کا ایک حصہ عالمِ آفاق سے بھی متعلق ہے۔ یعنی اس کی طبعی زندگی، اس کا نظامِ بدن انہی قوانین کے مطابق چلتا ہے جو قوانین حیوانات کی طبعی زندگی میں کارفرما ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان، کائنات ہی کی فضاؤں میں سکونت پذیر ہے، اس لئے کائناتی قوتیں بھی اس کی زندگی کے نظامِ طبعی پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً کسی جگہ زلزلہ آجاتا ہے تو ہزاروں انسان دب کر مر جاتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے تو بستیوں کی بستیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ انسان کائنات کی ان خارجی قوتوں کو مسخر کر سکتا ہے، لیکن جو قوتیں ہنوز اس کے دامِ تسخیر سے باہر ہیں، وہ ضرور اس پر غلبہ پالیتی ہیں۔ جس چیز کا نام تم نے "اتفاق" رکھا ہے اس کا ایک حصہ انہی قوتوں کے غلبہ سے متعلق ہے۔ یہ "اتفاق" محض اس وقت تک "اتفاق" (Chance) رہتا ہے جب تک کائنات کی ان قوتوں کے اسباب و علل انسان کی نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ جب یہ اسباب و علل انسان کی سمجھ میں آجاتے ہیں تو یہ قوتیں مسخر ہو جاتی ہیں اور تسخیر شدہ قوتیں، قاعدے اور قانون کے مطابق کارفرما رہتی ہیں۔ ان میں "اتفاق" کا طلسم ختم ہو جاتا ہے۔

"اتفاق" کا دوسرا حصہ وہ ہے جو انسانی دنیا سے متعلق ہے اور یہی وہ حصہ ہے جس کی طرف تم نے اپنے اعتراض میں اشارہ کیا ہے یعنی تمہارا کہنا یہ ہے کہ عام قاعدے کے مطابق، ثمر، محنت کے ماحصل کا نام ہونا چاہئے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے بیشتر ثمرات ان کی سعی و کاوش کا ماحصل نہیں ہوتے، بلکہ ایسی راہوں سے آتے ہیں جنہیں سعی و کاوش اور جد و جہد سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا۔ انہی کا نام تم نے "اتفاقات" رکھا ہے۔ لیکن اگر تم غور کرو سلیم! تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ "اتفاقات" دراصل ہمارے غلط معاشری نظام کا نتیجہ ہیں۔ صحیح معاشری نظام میں ہر نتیجہ قاعدے اور قانون ہی کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اس میں ثمرات، سعی و کاوش ہی کا ماحصل قرار پاتے ہیں۔ جس طرح کائنات کی مسخر شدہ قوتوں میں "اتفاقات" کا طلسم باقی نہیں رہتا، اسی طرح صحیح معاشری نظام میں بھی "اتفاقات" کا سم سم ختم ہو جاتا ہے۔ وہاں "ومن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" کا بے لاگ قانون کارفرما ہوتا ہے جس میں عملِ انسانی کا ذرہ ذرہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور بے عملی کوئی ثمر پیدا نہیں کرتی۔ نہ ہی غلط عمل، صحیح نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ ہم نے اپنے اوپر غلط نظام مسلط کر رکھا ہے اور اس کے نتائج کو "اتفاقات" کا نام دیکر انہیں "فضلِ خداوندی" کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ذرا غور کرو سلیم! "ھذا من فضل ربی" کے یہ بڑے بڑے درخشندہ اور مقدس کتبے، کیا اس غلط معاشری نظام کے "اتفاقات" ہی کے مظہر نہیں ہیں؟

اب یہ بات سامنے آگئی جائے کہ غلط نظام میں یہ "اتفاقات" وقوع پذیر کس طرح ہوتے ہیں؟ ہم کہتے یہ ہیں کہ غلط نظام طاغوتی نظام ہوتا ہے۔ اس میں "ابلیس" کا قانون کارفرما ہوتا ہے۔ ذرا سوچو کہ "ابلیس" کرتا کیا ہے؟ وہ کسی دوسری دنیا سے، دولت یا قوت لاکر "اتفاقات" کے ذریعے بہم نہیں پہنچادیتا۔ وہ کرتا صرف یہ ہے کہ دولت اور قوت کی تقسیم ناہموار طریق سے کردیتا ہے۔ یعنی قانونِ بقائے توانائی (Law of Conservation of Energy) کی طرح دولت یا قوت کی مقدار تو اتنی ہی رہتی ہے، صرف اس کی تقسیم ناہموار ہوجاتی ہے۔ (اسی کا نام فساد ہے)۔ وہ ایک طبقہ سے اس کی محنت کا ماحصل چھین کر دوسرے طبقہ کو بلاسعی و محنت دیدیتا ہے (اسی، بلاسعی و محنت یافت کا نام "اتفاق" ہے)۔ یہ معاشی فساد ہے۔ اسی طرح وہ ایک طبقہ کی اختیاراتی قوتوں کو چھین کر دوسرے طبقہ کو دیدیتا ہے۔ اس کا نام "سیاسی فساد" ہے۔ (چھین کر کیا دیدیتا ہے؟ وہ اس مقصد کے لئے ایسے ایسے غلط تصورات پیدا کردیتا ہے جس سے ایک طبقہ اپنی قوتوں کو از خود دوسرے طبقہ کے حوالے کرکے ان کے رحم و کرم پر جینے کا خوگر ہوجاتا ہے اور اپنے آپ کو فریب دینے کیلئے اس کا نام "مقدر" رکھ لیتا ہے)۔ یہی وہ معاشی فساد ہے جس کے متعلق اقبال کہتا ہے کہ

فرنگ آئینِ رزاقی بداند   بایں بخشد ازو وامی ستاند
بہ شیطاں آنچناں روزی رساند   کہ یزداں اندراں حیراں بماند

اسی طرح اقبال سیاسی فساد کے پیدا کردہ خداؤں کے متعلق کہتا ہے کہ ان کی قوت بھی اپنی نہیں ہوتی۔ اس لئے ان کی حقیقت یہ ہوتی ہے

ایں خدا چوں سجدہ اش کردی خداست   چوں یکے اندر قیام آئی فناست

یہ سب کچھ لازمی نتیجہ ہے اس غلط نظام کا جو تنہا عقل کی رو سے قائم کیا جاتا ہے۔ اگر سلیم! انسان اپنے معاشرتی نظام کو وحی کی متعین کردہ بنیادوں پر استوار کرلے تو اس میں نہ غلط تقسیم ہوتی ہے اور نہ ہی وہ "اتفاقات" باعث فریب نگاہ بنتے ہیں، جن کا نام معاشی دنیا میں "فضل ربی" رکھ کر دھوکے کا جال بچھایا جاتا ہے اور سیاسی دنیا میں ظل الٰہی اور نیابت خداوندی کے سحر مقدس سے اپنی ہوسِ خون آشامی کی تسکین کی جاتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد، سلیم! یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آگئی ہوگی کہ انسان کی معاشرتی دنیا میں جن چیزوں کو ہم "اتفاقات" قرار دیکر "منجانب اللہ" متصور کرلیتے ہیں، وہ درحقیقت ہماری معاشرتی ناہمواریوں کے نتائج ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ضابطے میں "اتفاقات" کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جس خدا کے تخلیقی قانون کی یہ کیفیت ہو کہ آسمان کے محیر العقول کرّے اس قدر حیرت انگیز جسامت اور حیران کن رفتار کے باوجود ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہوسکتے، کیا اسی خدا کے قانون کا وہ حصہ جو انسانی اعمال اور ان کے نتائج سے متعلق ہے، (معاذ اللہ) اسقدر "سکھا شاہی" کا قانون ہوجائے گا کہ جسے چاہے، بلاقاعدہ اور قانون فراوانی رزق عطا کردے اور جس پر چاہے روزی کے دروازے بند کردے؟ سبحان اللہ تعالیٰ عما یصفون۔

اللہ تعالیٰ جہاں "من یشاء" کہتا ہے اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ جسے چاہا "موج میں آکر" خزانے بخشدئے اور جسے چاہا "خفگی میں آکر" نان شبینہ تک سے محتاج کر دیا خدا کی مشیت، اس کے قانون ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور انسانوں کی دنیا میں اس کا قانونِ مشیت انسانوں ہی کے ہاتھوں سے نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ یعنی جب انسانی نظام، خدا کے ضابطے کے مطابق متشکل ہوگا تو اس کے نتائج قانونِ مشیت کے مطابق خوشگوار مرتب ہوں گے اور جب یہ نظام غیر خدائی ضابطے کے مطابق ہوگا تو اس کے عواقب قانونِ مشیت کے مطابق ناخوش آئند ہوں گے۔ یہ خدا کا قانون ہے۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ اور تم خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ لہٰذا جو قانون اپنے نتائج کے اعتبار سے اٹل اور غیر متبدل ہو، اس میں "اتفاقات" کا کیا دخل، اور بلا سعی و محنت ثمرات حاصل کرنے کی توقع کیسی؟ اس میں قدم قدم پر جزاء بما کانوا یعملون کا قانون، خوشگواریوں اور بدحالیوں کی میزان بنتا ہے۔

قسمتِ بادہ باندازہ جام است اینجا

اس کے برعکس یہ "ابلیسی نظام" کے کرشمے ہوتے ہیں کہ

دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

تمہاری بیتابی تمنا مجھ سے رہ رہ کر پوچھتی ہے کہ قرآن کا یہ نظامِ ربوبیت، جو نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت ہے، کس سرزمین میں متشکل ہوگا اور کب ہوگا؟ اس کے متعلق میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں کہ اس نظام کی تشکیل کے لئے اولیں مرحلہ یہ ہے کہ اس کا صحیح اور واضح تصور ذہنوں میں جاگزیں ہو جائے، اس لئے کہ انسان کی خارجی دنیا میں کوئی انقلاب وقوع پذیر نہیں ہو سکتا جب تک پہلے اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی پیدا نہ ہو جائے۔ اندرونی تبدیلی کے بغیر ہنگامے تو واقعہ ہو سکتے ہیں، انقلاب ظہور میں نہیں آسکتا۔ مجھے اس ذہنی تبدیلی کے آثار اسلامی ممالک میں کہیں نظر نہیں آتے بجز سرزمینِ پاکستان کے۔ میں قریب قریب ہر اسلامی ملک کے ارباب فکر سے ملا ہوں اور جن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا ان کے فکر کا مطالعہ کیا ہے۔ تم حیران ہو گے سلیم! مجھے خالص قرآنی فکر کہیں دکھائی نہیں دیا اور خالص قرآنی فکر کے بغیر، قرآنی نظام کی تشکیل کا تصور بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہاں یا تو اس فکر کا نام اسلامی فکر رکھا جاتا ہے جو ہم میں ہزار برس سے متوارث چلا آرہا ہے، اور جس کے متعلق میں تمہیں کئی بار بتا چکا ہوں کہ وہ یہود، نصاریٰ اور مجوسیوں کی اس سازش کا نتیجہ ہے جو انھوں نے اسلام سے انتقام لینے کی خاطر نہایت منظم طریق سے کی اور اس میں بیحد کامیاب رہے۔ اور یا "اسلام کو ایک نجی عقیدہ قرار دیکر عملی دنیا میں مغرب کی تقلید کی جاتی ہے۔ اس باب میں ہم پاکستانی مسلمان بڑے خوش بخت واقع ہوئے ہیں کہ یہاں خالص قرآنی فکر کی تابناک شعاعیں ضوفشاں ملتی ہیں۔ مبدأ فیض کی کرم گستری سے یہیں اقبال پیدا ہوا جس نے اسلامی فکر پر چھائے ہوئے عجمی تصورات کو الگ کر دینے میں اپنی عمر صرف کر دی اور اپنی نوائے شوق سے ملتِ اسلامیہ کو قرآن کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ یہی سرزمین

حافظ سید محب الحق (مرحوم و مغفور) کی بصیرتِ قرآنی کی جلوہ گاہ بنی کہ جنھوں نے قریب ساٹھ ستر برس مسلسل قرآن کی طرف دعوت دی۔ آج اسی سرزمین میں علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ العالی کی قرآنی فکر برگ و بار لا رہی ہے جنھوں نے اپنی عمرِ عزیز اسی جہاد کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ . . . . . (اللہ تعالیٰ انھیں تادیر سلامت رکھے تاکہ ہم ان کے تدبر فی القرآن کے نتائج سے زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں) میرے کاشانۂ فکر میں سلیم! اگر تمہیں کوئی چمکتی ہوئی کرن دکھائی دیتی ہے تو وہ انہی کے جلائے ہوئے دیوں کا فروغ ہے۔ اس قرآنی فکر کی مثال مسلمانوں کے کسی اور ملک میں نظر نہیں آتی۔ اس لئے میری تمام توقعات اسی سرزمین سے وابستہ ہیں۔ یہی میری آرزوؤں کی محور اور میری تمناؤں کی مرکز ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس فضا پر بھی بڑے بڑے دبیز بادل چھا رہے ہیں تاکہ آفتابِ قرآنی کی یہ تابندہ شعاعیں، اندھیرے میں جینے والی چمگادڑوں کیلئے وجہِ خیرگی نگاہ نہ بن جائیں۔ لیکن بایں ہمہ، اگر اس فکر کی تابانی کے کہیں امکانات ہیں تو وہ یہی سرزمین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں سلیم! تمہیں اور تمہاری وساطت سے تمام نوجوانانِ ملت کو تاکید کرتا رہتا ہوں کہ اس سرزمین کی حفاظت اور استحکام کے لئے اپنی جانیں تک وقف کر دو۔ یہ محض اس لئے کہ اگر کسی سرزمین میں قرآنی نظام کی تشکیل کے امکانات (زود یا بدیر) ہو سکتے ہیں تو وہ یہی خطۂ زمین ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ نامساعد حالات کے ان جھکڑوں میں کسی نہ کسی طرح اس دیئے کو جلائے رکھوں۔ وہ دیا جو تیل کی جگہ خونِ جگر سے روشن ہوتا ہے۔ اگر غمِ اسلام کی علمبردار ملائیت کی تند و تیز ہواؤں نے اسے سرِ بام نہ چلنے دیا تو تہِ داماں جلاؤں گا۔ اور اگر ان کی یورشیں وہاں تک بھی پہنچ گئیں تو اسے سینہ کے محراب میں، فانوسِ قلب میں روشن رکھوں گا کہ وہاں کوئی قوت اسے بجھا نہیں سکیگی! اس کے ساتھ ساتھ سلیم! تمہاری سلامتی کی دعائیں مانگونگا تاکہ مرتے وقت اس گراں بہا امانت کو تمہارے سپرد کر کے اطمینان کی موت مروں۔ یاد رکھو سلیم! دنیا میں فروغِ آدمیت صرف قرآنی چراغ سے ہو سکے گا۔ اور بس۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

اب رہا یہ کہ ایسا کب ہوگا؟ سو اس کے جواب میں عام طور پر کہہ دیا جاتا ہے کہ جب اللہ چاہے گا۔ اور میں جب اللہ سے یہی سوال کرتا ہوں تو وہاں سے جواب ملتا ہے کہ "جب تم چاہو گے" اس لئے کہ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم (۱۳/۱۱) اللہ کا قانون اُسوقت خارجی انقلاب لایا کرتا ہے جب قوم میں داخلی انقلاب پیدا ہو جائے۔ یہی وہ داخلی انقلاب ہے جس کے لئے سب سے پہلے نوجوانانِ ملت کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنی ضروری ہے۔ اور یہ تبدیلی اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کے سامنے وہ قرآنی تصورات بے نقاب کئے جائیں جن سے عہدِ محمدؐ رسول اللہ والذین معہ میں وہ انقلاب پیدا ہو گیا جس کی مثال پھر سامنے نہیں آئی۔ میری زندگی کا مقصود انہی قرآنی تصورات کا عام کرنا ہے۔ ولو کرہ المشرکون۔ والسلام

پرویز

عربی خط

(علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ)

(نوشتہ ۱۹۲۰ء)

دنیا کی ہر قوم اپنے آبائی خط سے بالطبع مالوف اور مانوس ہوتی ہے اور خاص کر جبکہ وہ دینی اور مذہبی خط ہو تو اور بھی اس کو متبرک اور مقدس سمجھ کر اس کی حفاظت اور اشاعت میں کوشش کرتی ہے۔ یہودیوں کا ابتدائے عہد سے یہ حال ہے کہ جس ملک میں جاتے ہیں، وہاں کی زبان کو عبرانی ہی خط میں لکھتے ہیں۔ عربی، فارسی، ترکی، جرمنی، نیز اسپینش وغیرہ زبانوں کو وہ اسی خط میں لکھتے ہیں اور ان زبانوں میں اخبارات و رسالے اسی خط میں نکالتے ہیں۔ اسپین کے یہودی قسطنطنیہ سے ایک اخبار اسپنش زبان اور عبرانی خط میں شائع کرتے ہیں۔ نیویارک سے جرمن زبان کا ایک اخبار عبرانی خط میں نکلتا ہے۔ نیز تونس سے عربی زبان کے کئی اخبار عبرانی خط میں چھپ کر شائع ہوتے ہیں۔

مصر اور شام میں عربی زبان کو زمانۂ قدیم سے یہود عبرانی حروف میں لکھتے چلے آتے ہیں۔ سعید فیومی جس نے سب سے پہلے توریت کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، اس نے اس کو عبرانی ہی خط میں لکھا تھا۔ موسیٰ بن میمون یہودی جو سلطان صلاح الدین کا طبیب خاص تھا اپنی تمام تصانیف عربیہ کو عبرانی ہی خط میں لکھتا تھا۔

یہی کیفیت نصاریٰ کی تھی کہ ملک شام میں جب اسلام کا غلبہ ہوا اور وہاں عربی زبان رائج ہوئی تو اس زبان کو سریانی خط میں لکھتے تھے اور اس کو خط کرشونی کہتے تھے اسی خط میں پیرس سے ۱۸۲۷ء میں انجیل شائع کی گئی۔

ارمنی اور یونانی جو بلاد عثمانیہ میں بستے ہیں وہ اپنے اخباروں کو ترکی زبان اور یونانی یا ارمنی خط میں شائع کرتے ہیں۔ اسی طرح بلغاریہ کے کیتھولک بلغاری زبان کو لاطینی خط میں لکھتے ہیں۔ ان قوموں نے اپنی زبان کی تو حفاظت نہ کی لیکن اپنے خط کو محفوظ رکھا۔

مگر امت اسلامیہ نے عربی زبان اور عربی خط دونوں کی حفاظت اور اشاعت میں جو کوشش کی ہے وہ دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ عربی زبان کے متعلق مسلمانوں کے کارناموں کو میں اپنے مضمون "فضائل زبان عربی" میں مفصل طور پر لکھ چکا ہوں۔ اب اس موقعہ پر عربی خط کی اشاعت کی کیفیت دکھلانی چاہتا ہوں کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کس طرح اس نے متمدن قوموں کے

خطوط کو مٹا کر ان کی جگہ خود لے لی اور کس قدر عظیم الشان غلبہ اقصائے عالم میں اس کو حاصل ہوا، تاکہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی اور مذہبی خط کی قدر معلوم ہو اور وہ بھی اس کی خوبیوں کو دیکھ کر اس کی حفاظت اور اشاعت میں اُسی طرح کوشش کریں جس طرح ان کے اسلاف کرام نے کی۔

دنیا کی تمام زبانیں چار مختلف اقسام میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(۱) سامی زبانیں، یعنی عبرانی، سریانی، نبطی، ارامی، کلدانی، عربی وغیرہ جن کی زندہ قائم مقام اب صرف عربی ہے۔

(۲) ایرانی زبانیں۔ فارسی، کردی، پشتو، سنسکرت، ملائی، جاوی وغیرہ نیز یورپ اور امریکہ کی تمام زبانیں اس میں داخل ہیں۔

(۳) تورانی زبانیں۔ مثلاً ترکی، تاتاری، چینی، جاپانی وغیرہ۔

(۴) حامی زبانیں۔ جو افریقہ میں بولی جاتی ہیں مثلاً بربری، نوبی، حبشی وغیرہ۔

جس طرح ان زبانوں میں اصولِ لسانیہ کے لحاظ سے باہمی فرق ہے، اسی طرح ان کے خطوط میں بھی تفاوت ہے۔ سامی خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دائیں طرف سے لکھے جاتے ہیں۔ ایرانی خطوط تمام تر بائیں طرف سے اور تورانی خطوط بھی متصل حرف میں بائیں طرف سے بہ شکل عمود قائمہ لکھے جاتے ہیں۔

عربی خط کی ایجاد اور اس ماخذ

بعض نازک خیال مورخ عربی خط کا سلسلہ مصر کے قدیم خط ہیرو غلیفی سے لیجا کر ملاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہیرو غلیفی سے خط فینیقی اور اس سے خط ارامی مشتق ہوا جو سامی زبانوں کے خطوط کا ماخذ ہے۔ لیکن عام طور پر مورخین کا بیان یہ ہے کہ عربی خط سریانی خط سے نکلا ہے جس کو خط سطرنجیلی کہتے ہیں۔ اس اشتقاق کی دلیل یہ ہے کہ عربی خط اور خط سطرنجیلی اس قدر باہم مشابہ ہیں کہ بادی النظر میں ان کی ایک کی شکل اور نوعیت معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ بریں سریانی حروف کی ترتیب ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، پر ہے۔ ابتدا میں عربوں نے بھی حروف تہجی کو اس نہج پر رکھا تھا اور چونکہ عربی میں چھ حروف نئے نکالے گئے جو سریانی میں نہیں تھے، اس لئے دو لفظ ثخذ، اور ضظغ اور بڑھا دیے گئے۔

ان چھ زائد حروف یعنی ث، خ، ذ، ض، ظ، غ کے لئے عربوں نے نئی صورتیں نہیں اختراع کیں، بلکہ انھیں کے ہم مخرج حروف کی شکلیں ان کے لئے مستعار لے لیں۔ مثلاً جن عربی لفظوں میں ث ہے وہ لفظ سریانی زبان میں جب جاتے ہیں تو ث کا تلفظ ت کا ہو جاتا ہے۔ جن میں خا ہے اس کو حا اور جن میں ذال ہے اس کو دال پڑھتے ہیں۔ اسلئے انھیں حروف کو جو سریانی میں موجود ہیں ایک ایک نقطہ لگا کر عربی حروف بنا لیا۔ صرف ض کی شکل عبرانی سے لی گئی، کیونکہ جن لفظوں میں ض ہے سریانی میں اس کو عین سے ادا کرتے ہیں اور عبرانی میں ص سے۔ مثلاً ارض کو سریانی میں ارع اور عبرانی میں ارص پڑھیں گے۔ اور

چونکہ ص اور ض قریب المخرج ہیں، علاوہ بریں ع کی شکل غ کے لئے لی جا چکی تھی، اس لئے عبرانی سے ص کو لیکر اس پر ایک نقطہ لگا کر ض بنا لیا۔ اس طرح پر عربی حروف کی تعداد ۲۸ ہوگئی اور ان کی شکلیں صرف ۱۴ ہیں۔ باہمی امتیاز کے لئے نقطے مقرر کئے گئے۔

اعراب یعنی حرکت اور وقف

بعض زبانیں ایسی ہیں کہ ان کے خطوں میں حرکات مطلق نہیں ہیں جیسے سامری زبان، اور بعض زبانوں میں ان کے لئے حروف مقرر کئے گئے ہیں جو حروف تہجی میں شمار ہوتے ہیں اور سطروں میں لکھے جاتے ہیں۔ ان خطوط کے لکھنے میں محنت اور وقت دونوں زیادہ صرف ہوتے ہیں اور جگہ بھی زیادہ گھیرتے ہیں۔ ایرانی زبانوں کے خطوط کا بالعموم یہی حال ہے۔ بعض خطوط اس قسم کے ہیں کہ حرکتوں کے اختلاف سے ان میں حروف کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں مثلاً خط حبشی کہ اس کا ہر حرف مختلف حرکت کی حالت میں مختلف صورت رکھتا ہے۔ ایسے خطوط کی کتابت میں دقت اور غلطی واقع ہوتی ہے۔

ان سب کے خلاف سامی خطوط میں حرکات کیلئے علامتیں ہیں جو اوپر نیچے لگائی جاتی ہیں۔ اس میں آسانی یہ ہے کہ جہاں ضرورت سمجھیں ان کو استعمال کریں ورنہ چھوڑ دیں۔ اسی وجہ سے عربی کتابت ایک قسم کی مختصر نویسی ہوگئی۔ دنیا کا کوئی خط اس قدر آسانی اور سرعت کے ساتھ اور تھوڑی جگہ میں نہیں لکھا جا سکتا جس قدر کہ عربی خط لکھا جا سکتا ہے۔

عربی خط پر اعتراض

بعض ناواقف اور متعصب لوگوں کی زبان سے عربی خط پر یہ اعتراض سننے میں آیا کہ اس میں حروف اور الفاظ کی باہمی مشابہت کی وجہ سے پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے نیز حرکات کے لئے چونکہ حروف متعین نہیں ہیں اور صرف علامتوں سے کام لیا جاتا ہے اس لئے ان میں سہل انگاری ہونے کی وجہ سے عبارت صحیح نہیں پڑھی جا سکتی۔ اندلس میں بھی بعض لوگوں نے اس قسم کے اعتراضات عربی خط پر کئے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کوئی وزنی اعتراض نہیں ہے۔ حروف کے باہمی امتیاز کے لئے نقطے مقرر ہیں۔ حرکات کے لئے علامتیں ہیں۔ علاوہ بریں یہ معترضین نقطوں اور حرکتوں کو جس قدر ضروری سمجھتے ہیں اس قدر واقع میں ان کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کتابوں، اخباروں نیز خطوں اور نوشتوں کی اردو صحیح صحیح پڑھ لیتا ہے حالانکہ ان میں نقاط اور اعراب کی کہاں پابندی کی جاتی ہے۔ خط مسلسل یا اور اس قسم کے خطوط جن کے لکھنے والوں کا منشا یہ ہوتا ہے کہ سوائے ان کے خاص احباب کے اور کوئی ان کو نہ سمجھ سکے ان پر اعتراض کرنا فضول ہے۔ آج ہزار ہزار برس کی کتابیں عربی خط میں لکھی ہوئی کتب خانوں میں موجود ہیں اور لوگ ان کو شروع سے آخر تک صحیح صحیح پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کسی خط کے مکمل ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بے کم و کاست صحیح صحیح پڑھا جا سکے۔

ایک غلطی کا ازالہ

بعض لوگوں نے ایک یہ روایت مشہور کر رکھی ہے کہ عربی خط میں نہ پہلے نقطے تھے نہ حرکتیں۔ قرآن شریف کے مدون ہونے کے نصف صدی کے بعد نصر بن عاصم نے نقطے اور ابوالاسود دؤلی نے اعراب ایجاد کئے یہ روایت غلط ہے۔ عربی خط میں کئی کئی حرفوں کا ہم شکل ہونا ہی اس امر کی دلیل ہے کہ ایجاد ہی کے وقت ان میں باہمی امتیاز کیلئے

نقطے مقرر کئے گئے ہوں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ "عربی خط کے موجد تین شخص ہیں۔ مرار نے شکلیں وضع کیں، اسلم نے جوڑ ملانے کا طریقہ نکالا اور عامر نے نقطے اور اعراب ایجاد کئے۔

ابوالاسود دؤلی نے اعراب نہیں ایجاد کئے بلکہ علم الاعراب یعنی نحو کے چند اصول ترتیب دیئے ہیں۔ عربی خط ظہور اسلام سے پہلے ہی تکمیل کی حد کو پہنچ چکا تھا۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ

دولت تبابعہ کے عہد میں ملک یمن میں عربی خط ضبط استحکام اور خوبی کے لحاظ سے مکمل ہو چکا تھا اس لئے کہ وہاں تمدن اور شائستگی تھی اس خط کا نام خط حمیری ہے۔ وہاں سے یہ خط منتقل ہو کر حیرہ میں آیا اور حیرہ سے مکہ اور طائف کے تاجروں نے سیکھا۔

حرکات کا عربوں کو اس قدر خیال تھا کہ معمولی اعراب کے علاوہ انھوں نے مد کی ایک خاص علامت اختراع کی اور مزید براں اس کے اظہار کے لئے حرف علت کو بھی ضروری سمجھا۔

عربی خط حجاز میں

اسلام سے پہلے ملک عرب میں اہل حجاز خاص طور پر فن کتابت سے ناآشنا تھے۔ کیونکہ ان کی سادہ زندگی میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ البتہ ان کے اردگرد جو عربی قومیں آباد تھیں ان میں فی الجملہ تمدن تھا۔ اسی وجہ سے ان میں کتابت رائج تھی۔ چنانچہ شمال میں نبطی قومیں خط نبطی میں اور یمن میں حمیر خط مسند میں کتابت کرتے تھے۔ اہل حجاز چونکہ ملک شام، عراق اور یمن میں تجارت کی غرض سے آتے جاتے تھے، انھوں نے بھی تجارتی حساب کتاب لکھنے کے لئے ان قوموں سے لکھنا سیکھ لیا۔

مورخین کا بیان ہے کہ حجاز میں سب سے پہلے حضرت ابوسفیانؓ نے جو مکہ کے ملک التجار تھے کتابت سیکھی۔ لیکن اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے ہاتھ کا ایک نوشتہ ملا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی لکھنا جانتے تھے۔

عربی خط کی قدیم ترین شکلیں خط نسخی اور خط کوفی ہیں۔ خط نسخی حجاز کے سوداگروں نے تجارت گاہ شام میں حوران کے نبطیوں سے سیکھا اور خط کوفی عراق عرب کے پایہ تخت شہر حیرہ سے حجاز میں آیا۔ اس کو پہلے خط حیری کہتے تھے، لیکن جب حضرت عمرؓ نے حیرہ کے متصل عراق عرب کے صدر مقام کوفہ کو آباد کیا تو یہی خط خط کوفی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

عربی خط اور اسلام

حجاز میں اگرچہ چند افراد کتابت سے آشنا ہو گئے تھے لیکن ان کی تعداد اس قدر کم تھی کہ بالعموم عرب کو "امیین" (ناخواندہ) کے لفظ سے تعبیر کر سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ کے ساتھ ان کو خطاب فرمایا ہے: هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا۔ ظہور اسلام کے بعد عربی خط کا ستارہ بلند ہونا شروع ہوا جس کا اصل باعث قرآن شریف ہے کیونکہ پہلی وحی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی یہ تھی:۔

اقرأ باسم ربك الذي خلق ۔ خلق الانسان من علق ۔ اقرأ وربك الاكرم الذي علم بالقلم علم الانسان مالم يعلم ۔

دوسری سورت میں اللہ تعالیٰ قلم اور نوشتوں کی قسم کھاتا ہے۔

ن والقلم وما یسطرون۔

اسلام کے ساتھ ہی ساتھ عربی خط کی بھی اشاعت شروع ہوئی کیونکہ خود آنحضرتؐ کو وحی آسمانی اور ان خطوط کے لکھنے کے لئے جو غیر ملکوں کے بادشاہوں کو بھیجے جاتے تھے کاتبوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ عرب میں سب سے پہلے جس نے عام طریقہ پر خط کی اشاعت کی کوشش شروع کی وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کی یہ خواہش تھی کہ امت عربیہ میں بالعموم کتابت کو رائج کر دیں۔ اس کی شہادت اس واقعہ سے بھی ملتی ہے کہ جنگ بدر میں جو کافر اسیر ہوئے تھے، ان میں سے جن کو لکھنا آتا تھا ان کا فدیہ آپ نے یہ مقرر فرما دیا تھا کہ وہ مدینہ کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھا دیں اور آزاد ہو جائیں۔

خلفاء راشدین اور بعض دیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کتابت جانتے تھے اور وہی لوگ آیاتِ قرآن اور آنحضرتؐ کے خطوط لکھتے تھے۔ اکثر صحابہ نے آپ کا رجحانِ طبع دیکھکر زمانہ اسلام میں کتابت سیکھ لی اور مسلمانوں میں اس کا رواج ہو چلا یہانتک کہ مدینہ شریف میں بعض بعض عورتیں بھی کتابت کرتی تھیں۔ خود ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا لکھ پڑھ سکتی تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء نے بھی نشر خط کی تحریک جاری رکھی، یہانتک کہ لوگوں کی نظروں میں کتابت ایک شریف فن ہو گیا اور اہل عرب جو صرف شجاعت اور فیاضی کو انسان کا قابل فخر جوہر سمجھتے تھے اور کتابت کو حیاکت اور خیاطت کی طرح ایک معمولی پیشہ خیال کرتے تھے اب اس کو بھی انسانی کمالات کی فہرست میں داخل کرنے لگے۔ چنانچہ "کامل" اسی شخص کو کہنے لگے جو تیر اندازی، تیراکی اور کتابت تینوں فن جانتا ہو۔

یہ تو معلوم ہے کہ اس زمانے میں سوائے قرآن شریف کے عربی زبان میں کوئی دوسری کتاب نہیں تھی۔ جب حضرت عثمانؓ نے مصاحف لکھوا کر مختلف صوبوں میں بھجوائے تو اہل قلم اسی کی کتابت میں منہمک ہو گئے۔ اس کی نقل میں باہم مقابلہ کی وجہ سے عربی خط کو فروغ ہوا۔

خط کوفی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین و نیز بنی امیہ کے عہد تک چونکہ اہل اسلام کو زیادہ تر جنگ و فتوحات میں مشغول رہنا پڑا اس وجہ سے سوائے قرآن شریف کے دوسری چیزوں کی کتابت کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی۔

اس زمانہ میں کتابت خط کوفی میں ہوتی تھی۔ بنی امیہ کے آخر عہد میں قطبہ کاتب نے جو اپنے زمانہ کا رئیس الکتاب تھا خط کوفی کی چار مختلف نوعیتیں قائم کیں۔ پھر ابتدائے دولت عباسیہ میں ضحاک بن عجلان نے جو خلیفہ سفاح کے زمانہ میں تھا قطبہ کے حدود سے بھی آگے قدم بڑھایا۔ اور منصور اور مہدی کے عہد میں اسحٰق بن حماد نے اس خط کی اور بھی شاخیں نکالیں۔ چنانچہ خط کوفی کی بارہ قسمیں ہو گئیں جن کے نام حسب ذیل ہیں:-

قلم الجلیل۔ یہ خط مسجدوں کی محرابوں اور متبرک مقاموں کے در و دیوار پر کتبہ لکھنے میں کام آتا تھا۔ اب اس کو خط جلی کہتے ہیں۔

قلم التسجلات[2]۔ قلم الدیباج[3] قلم ارسطومار[4] الکبیر۔ قلم الثلثین[5]۔ قلم الزنبور[6]۔ قلم المنقح[7]۔ قلم الحرم[8]۔ سلاطین اور ملوک کی حرم سراؤں میں مستعمل تھا۔ قلم المؤامرات[9]۔ امراء باہمی مشورہ لینے میں اس خط کو کام میں لاتے تھے۔ قلم العہود[10]، دستاویزیں اور بیعنامے وغیرہ اس میں لکھے جاتے تھے۔ قلم القصص[11]۔ قلم الخرفاج[12]۔

مامون عباسی کے عہد میں جب دوسری زبانوں سے علوم و فنون کے ترجمے ہونے لگے تو کتابت کو اور بھی ترقی ہوئی اور خط کوفی کی چند نئی شکلیں مخترع ہوئیں۔ قلم مرصع، قلم الریاسی۔ قلم النساخ۔ قلم الرقاع۔ قلم غبار الحلیہ وغیرہ۔ سلطنت کے مختلف کاروبار میں مختلف قسم کے خطوط مستعمل ہونے لگے اور خط کوفی کی تقریباً بیس قسمیں استعمال میں آنے لگیں۔

خط نسخی یہ خط عباسیوں کے ابتدائی عہد تک محض رسمی خط و کتابت میں کام آتا تھا۔ قرآن شریف اور سلطنت کے دفاتر میں اب تک تمام تر خط کوفی مستعمل تھا لیکن وزیر ابن مقلہ متوفی ۳۲۸ھ نے خط نسخی کو نہایت آراستہ و پیراستہ کیا اور اس کو اس قابل بنا دیا کہ بے تکلف وہ دین و دولت دونوں جگہ باریاب ہو گیا۔ یعنی دواوین سلطنت اور کتابت قرآن دونوں میں اس کا استعمال ہونے لگا۔

ابن مقلہ کے بعد متعدد کاتبوں نے اور بھی اس کو خوشنما بنایا۔ ابن البواب متوفی ۴۱۳ھ نے اس کی مختلف قسمیں اختراع کیں اور پھر یاقوت بن عبداللہ رومی مستعصمی متوفی ۶۹۸ھ نے اس کو درجہ کمال پر پہنچا دیا۔ اس کی مقبولیت یہانتک بڑھ گئی کہ رفتہ رفتہ خط کوفی کی جگہ اس نے لے لی۔

متاخرین خطاطوں میں خط کی چھ قسمیں زیادہ تر مشہور اور مستعمل تھیں۔ خط ثلث، ریحانی، نسخ، رقاع، محقق اور تعلیق۔ انھیں قسموں سے قلم دیوانی، قلم دشتی اور قلم فارسی وغیرہ دوسری شاخیں نکلیں۔

جب بغداد تباہ ہو گیا اور خلافت عباسیہ وہاں سے منتقل ہو کر مصر میں آ گئی تو یہاں بھی عربی خط کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا۔ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں ممالیک کے حالات بیان کرتے ہوئے آٹھویں صدی ہجری کے آخر میں عربی خط کی اقسام ذیل کا ذکر کیا ہے۔

الطومار الکامل۔ سلاطین کے مراسلات اور فرامین کے لئے۔

مختصر الطومار۔ اس کی دو قسمیں تھیں ثلث، و محقق۔ اس میں عہد نامے اور امراء اور ملوک کے نام خطوط لکھے جاتے تھے۔

ثلث۔ اس کی بھی دو قسمیں تھیں ثقیل اور خفیف۔

توقیع۔ وزراء اور حکام اس خط میں مسلوں پر توقیع لکھا کرتے تھے۔

رقاع۔ چھوٹے چھوٹے رقعوں کے لکھنے میں مستعمل تھا۔

غبار۔ نقوش اور کتبوں کے لئے۔

ممالیک کے زمانے کی عمارتوں پر جو کتبے ہیں ان کا خط بغداد کی عمارتوں کے کتبوں سے زیادہ خوشنما اور دلکش معلوم ہوتا ہے۔

سلطنت ممالیک کے زوال کے بعد اسلامی تمدن کے وارث ترک قرار پائے انھوں نے بھی خط کی ترقی میں اپنی توجہ مصروف رکھی اور قرون وسطیٰ کے مختلف قسم کے خطوط کی نگہداشت کی۔ گیارہویں صدی ہجری میں عربی خط کی تقریباً تیس قسمیں ان کے یہاں رائج تھیں۔ خط رقعہ، اور خط ہمایونی خود ترکوں کی ایجاد ہے۔ ترکوں میں حمد اللہ متوفی ۹۳۶ھ اور حافظ عثمان متوفی ۱۱۱۰ھ بے مثل خطاط گذرے ہیں۔

سامانِ کتابت بنی امیہ کے عہد تک چمڑے اور ہرن کی کھال وغیرہ مختلف چیزوں پر کتابت کی جاتی تھی۔ سلطنت کے دفاتر چمڑے اور کھال کے پولندوں کے مجموعے ہوتے تھے۔ عباسیوں کے عہد میں خالد بن برمک خلیفہ سفاح کے وزیر نے انھیں پولندوں کو کتابوں کی شکل میں مرتب کیا۔ ہارون الرشید کے زمانے میں جعفر بن یحییٰ برمکی نے کاغذ ایجاد کیا اسوقت سے عربی خط کی نمایاں ترقی شروع ہوئی۔

عربی خط کی مقبولیت یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ظہور اسلام کے وقت عربی خط صرف عرب میں محدود تھا اور وہاں بھی بہت کم لوگ تھے جو لکھنا جانتے تھے۔ جب اسلام نے جزیرہ نمائے عرب سے باہر قدم رکھا اور اہل عرب عراق، ایران، شام اور افریقہ میں پھیل گئے تو عربی زبان کے ساتھ ساتھ ان ملکوں میں عربی خط بھی رائج ہونے لگا۔ دنیا کی جن جن قوموں میں اسلام کی روشنی پہنچی عربی خط بھی ان میں مقبول ہوگیا۔ مشرق میں ملایا اور جاوا سے لیکر مغرب میں بحیرہ اڈریاٹک تک اور شمال میں سرد و ترکستان اور وسط روس سے لے کر جنوب میں اقصائے زنجبار تک جن میں ملائی، تاتاری، ہندی، سندھی، ترک، افغان، کرد، حبشی وغیرہ متعدد قومیں مختلف زبانیں بولنے والی بستی ہیں، عربی خط پھیل گیا۔ اور ان تمام قوموں نے اپنی اپنی زبانوں کو اسی خط میں لکھنا شروع کیا اور تقریباً ۲۵ کروڑ نفوس عربی خط کے قلم رو میں آگئے۔

اسلامی تمدن کی دوسری یادگاروں سے اگر قطع نظر بھی کریں تو عربی خط اس کی ایک ایسی دائمی یادگار ہے کہ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ جو قومیں اسلامی تمدن میں داخل ہوئیں، ان میں سے بعض بعض قوموں نے عربی دین کے ساتھ عربی زبان اور عربی خط کو بھی اختیار کر لیا۔ مثلاً شام، عراق، اور اکثر ممالک افریقہ کے باشندے۔

بعض بعض قوموں میں صرف دو ہی باتیں آئیں یعنی عربی دین اور عربی خط۔ جیسے ترک، ایرانی، افغانی، ہندی، سندھی وغیرہ۔ کسی قوم نے صرف عربی زبان اور عربی خط کو لیا مثلاً ممالک اسلامیہ کی ذمی رعایا اور کسی نے دین پر قناعت کی عربی زبان اور عربی خط نہ اختیار کر سکی جیسے چین کے مسلمان۔ لیکن باوجود اس کے عربی زبان اور عربی خط کی وہ لوگ دل سے عزت کرتے ہیں اور اس کو متبرک اور مقدس سمجھتے ہیں، قرآن شریف اور دعائیں اس زبان اور اسی خط میں لکھتے ہیں۔

الغرض جس طرح عربی زبان تمام دنیا کے مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اسی طرح عربی خط تمام اسلامی زبانوں کا مشترکہ خط ہے۔

مردم شماری یورپ میں ترک اور تاتاری قوموں کی تعداد جن کی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں دس ملین سے کم نہیں۔ ایشیا میں عربی خط میں کتابت کرنے والوں کی تعداد ۱۶۳ ملین سے زیادہ ہے، اور افریقہ میں تخمیناً ۷ ملین ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک میں اور بھی لاکھوں آدمی ہیں جو اس مردم شماری میں نہیں آئے لیکن وہ عربی میں کتابت کرتے ہیں۔ اب ان تینوں براعظم میں ان قوموں کی مجموعی تعداد جن کی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں ۲۴۳ ملین سے زیادہ ہے یعنی تقریباً ۲۵ کروڑ۔ خلاصہ یہ ہے کہ عربی خط افریقہ میں غالب، ایشیا میں شائع، یورپ میں مستعمل اور امریکہ اور آسٹریلیا میں مشہور اور معروف ہے۔

زبانوں کے لحاظ سے دیکھئے تو سامی زبانوں کی تمام انواع پر خود عربی اس قدر غالب آگئی کہ اس نے ان کو یا تو فنا کر دیا یا تقریباً مردہ بنا دیا اور ان کی جگہ خود لے لی۔

حامی زبانوں میں بھی اکثر زبانوں کو عربی نے فنا کر دیا۔ اب جو چند شاخیں اس کی باقی رہ گئی ہیں ان میں سے سات زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

تورانی زبان کی اہم ترین شاخ ترکی ہے، اس کی تمام قسمیں عربی خط میں آگئیں۔

ایرانی زبانوں کی دو قسمیں ہیں جنوبی اور شمالی۔ جنوبی میں سے سوائے سنسکرت کے کہ وہ برہمنوں کی مذہبی زبان ہے باقی اکثر عربی خط میں آگئیں البتہ شمالی ایرانی جن میں یورپ اور امریکہ کی زبانیں داخل ہیں یورپین خطوط میں لکھی جاتی ہیں۔

اب ہم ان زبانوں کو تفصیل وار لکھتے ہیں جو عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

ترکی زبانیں ترکی زبان کی مختلف قسمیں ہیں جن میں باہم تھوڑا تھوڑا سا اختلاف ہے۔ چینی ترکستان سے یورپین روس اور یورپین ٹرکی تک یہ زبانیں مستعمل ہیں۔ تاتاری، مغل، ازبک، ترکمان اور عثمانی ترک ان کو بولتے ہیں۔ یہ قومیں تقریباً کل کی کل مسلمان ہیں اور ان کی مجموعی تعداد چار کروڑ سے کم نہیں ہے۔

کاشغری ترکی چینی ترکستان یعنی تاتار میں مستعمل ہے۔ ایک کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کی یہ زبان ہے۔

ازبکی ترکی۔ وسطی شمالی روسی ترکستان میں جس کا مرکز سمرقند ہے یہ زبان بولی جاتی ہے۔ بولنے والوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ ہے۔

چغتائی ترکی۔ خیوہ اور بخارا کے ترکمان اور وسط ایشیا کے قبائل کی زبان ہے۔ پہلے یہ زبان چینی خط میں لکھی جاتی تھی جس کو خط اویگوری کہتے ہیں اور جو ابتک منچو قوموں میں مستعمل ہے۔ اس زبان کی سب سے پہلی کتاب جو عربی خط میں لکھی گئی وہ امیر علی شیر متخلص بہ نوائی متوفی ۹۰۶ھ کا ترکی دیوان ہے۔ امیر موصوف سلطان حسین والی ہرات کے وزیر تھے۔ دوسری کتاب

توزک بابری ہے جو بادشاہ بابر متوفی ۹۳۷ھ کی لکھی ہوئی ہے۔

اورنبرگی ترکی۔ یوروپین روس میں سائبیریا کے مغرب میں اورنبرگ اور اس کے قرب وجوار کے قبائل قوزاق (کاسک) کی زبان ہے۔ اس قوم میں مسلمان، عیسائی اور کچھ بدھ مذہب کے پیرو بھی ہیں۔

چرکسی ترکی۔ چرکس تمام تر مسلمان ہیں۔ بحر اسود کے شمال مشرق میں دریائے قوبان اور ترک کے کناروں پر پہاڑی علاقوں میں آباد ہیں۔ ان کی تعلیمی زبان عربی ہے۔ خط و کتابت بھی اسی میں کرتے ہیں۔ چرکسی زبان لکھی نہیں جاتی۔ حال میں محمد کمان بک چرکس نے اس زبان کے حروف تہجی ترتیب دیئے ہیں جن کی تعداد ۹۵ تک پہنچ گئی ہے۔

داغستانی ترکی۔ بحر خضر کے مغربی سواحل پر داغستان اور اس کے گردونواح میں بولی جاتی ہے۔ امام شامیل متوفی ۱۸۸۰ء مشہور سپہ سالار جو داغستان کی مدافعت میں تیس سال تک روس سے لڑتے رہے ان کے زمانے میں اس زبان نے ترقی حاصل کی اس کے بولنے والے تقریباً دس لاکھ آدمی ہیں۔ اسطراخان میں متعدد مطابع قائم ہیں جو اس زبان اور نیز عربی کی کتابیں شائع کرتے ہیں۔

داغستانی قوم آٹھویں صدی عیسوی میں اسلام لائی، اس وقت سے یہاں کی زبان عربی میں لکھی جانے لگی۔ داغستان کی دوسری زبان کوبکی بھی جو اس سے مختلف ہے عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔

آذربیجانی ترکی۔ ایشیائی قفقاز کے شمالی حصہ یعنی باکو۔ تفلیس۔ باطوم وغیرہ اور آذربیجان کے جنوبی حصہ میں مستعمل ہے۔ اس زبان میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں کئی اخبار نکلتے ہیں۔ شعر گوئی بھی ہوتی ہے لیکن سترہویں صدی عیسوی سے پہلے کا کوئی شعر اس میں نہیں پایا جاتا۔

نوجائی ترکی۔ بحیرۂ اسود کے شرقی سواحل پر قفقاز کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔

قرمی ترکی۔ نویں صدی عیسوی میں جزیرہ نمائے کریمیا اور جنوبی روس میں جو تاتاری مسلمان داخل ہوئے ان کی زبان ہے اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ بہت شامل ہیں۔

تاتاری یا قازانی ترکی۔ یوروپین روس قازان اور اس کے گردونواح میں بولی جاتی ہے۔ یہ ان تاتاری مسلمانوں کی زبان ہے جو یہاں آباد ہیں اور جن کی تعداد پندرہ لاکھ تخمینہ کی جاتی ہے۔ دسویں صدی عیسوی کے قبل یہی تاتاری روس پر حکمراں تھے اور روسیوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص سمجھا جاتا تھا جس کی لڑکی کسی مسلمان امیر کے گھر بیاہی ہو لیکن اب صدیوں سے یہ روس کے محکوم ہیں۔ ان میں سے سوائے ایک فرقہ یاتونیہ کے باقی سب مسلمان ہیں۔

اس زبان میں عربی یا فارسی آداب کی چربہ کشی نہیں کی گئی ہے بلکہ خود اس کے اصلی قدیمی ادبیات نظم و نثر موجود ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس میں عربی فارسی کے الفاظ کم پائے جاتے ہیں۔ تاتاری لوگ خالص ترکی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس زبان میں متعدد اخبار نکلتے ہیں اور سیکڑوں کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں روس کے مشہور مستشرق پروفیسر مینسکی نے یہ کوشش کی کہ یہ زبان روسی حروف میں لکھی جائے۔ اس کی وجہ یہ ظاہر کی کہ اس تبدیلی سے تاتاریوں کی ابتدائی تعلیم آسان ہو جائے گی اور در پردہ غرض یہ تھی کہ ادبیاتِ اسلامیہ سے ناواقف ہو کر وہ آر تھوڈکس مذہب میں داخل ہو جائیں۔ لیکن تاتاریوں نے عربی خط کا چھوڑنا گوارا نہ کیا اور عرصہ دراز تک سخت مقابلہ کرتے رہے۔ کسی طرح پر حریفوں کو اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہونے دیا یہاں تک کہ جب روس میں شاہی فرمان کی رو سے دستوری حکومت قائم ہوئی اور قوموں کے حقوق کسی قدر محفوظ ہوئے تو اس کش مکش سے نجات ملی۔

عثمانی ترکی۔ حکومتِ عثمانیہ کی شاہی زبان ہے جو اس کے تمام قلم رو میں مستعمل ہے۔ ترک، ارمن، کرد وغیرہ یہی زبان بولتے ہیں تمام ترکی زبانوں میں یہ زیادہ وسیع اور مہذب ہے۔

یہ اگرچہ ترکی زبان کی ایک شاخ ہے لیکن اب اس قدر ترقی پا گئی ہے کہ قدیمی ترکی سے اس کو کوئی مناسبت باقی نہیں رہی۔ ترکی زبان کی کوئی پرانی کتاب کسی عثمانی ادیب کو دی جائے تو وہ بہت کم اس کو سمجھ سکے گا۔

عثمانی ترکی دراصل چغتائی ترکی ہے۔ لیکن اس میں پچاس فی صدی عربی اور پندرہ فی صدی فارسی کے الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ عربی الفاظ کے کثرت سے شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت عثمانی کے قیام سے پیشتر یہ زبان تصنیف و تالیف کی زبان نہ تھی چونکہ ترک سلجوقی سلطنت کے وارث ہیں جن کا علم ادب فارسی تھا، اس لئے ترکی ادب کی بھی بنیاد فارسی ہی ادب پر رکھی گئی اور مذہبی علوم براہ راست عربی سے اخذ کئے گئے، اس لئے کچھ عربی کے الفاظ بتوسط فارسی کے اور کچھ براہ راست خود عربی سے اس میں آ گئے۔ اس زبان کی کتابت ابتدا ہی سے عربی خط میں ہوئی۔ عربی کے حروف تہجی سے اس میں چند حروف زائد ہیں ایک (ک) جس پر تین نقطے ہوتے ہیں اور تقریباً نون کی آواز دیتا ہے۔ دوسرا کاف یائی جو پڑھا نہیں جاتا۔ فارسی کے چاروں حرف پ، چ، ژ گ بھی اس کے حروف تہجی میں شامل ہیں۔

مذکورہ بالا زبانوں کے علاوہ ترکی زبان کی چند اور شاخیں بھی ہیں مثلاً سائبری، باشکیری، کاونشی، دباندی وغیرہ جن کی تفصیلی کیفیت نہیں معلوم ہو سکی۔ لیکن یہ سب کی سب بھی عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

فارسی فارس اگرچہ ایران کے ایک چھوٹے سے صوبے کا نام ہے جو خوزستان اور کرمان کے مابین واقع ہے اور جس کا مرکز پہلے اصفہان اور پھر شیراز رہا ہے لیکن اب تمام ایران کو فارس اور ایرانی زبان کو فارسی زبان کہتے ہیں۔ یہ زبان ایران اور افغانستان کی شاہی زبان ہے۔ ہندوستان میں بھی ۱۸۳۷ء تک سرکاری دفاتر کی زبان یہی تھی اور اب تک بھی ادبا ہندوستان

اس زبان کو حاصل کرتے ہیں۔ بلوچستان نیز کردستان میں بھی یہی زبان بولی جاتی ہے اس کے بولنے والوں کی تخمینی تعداد ۱۶ ملین ہے۔

ایران کی قدیم زبان جو تمام ایرانی زبانوں کی اصل ہے خط بابلی میں جس کو میخی یا مسماری یا پیکانی کہتے ہیں لکھی جاتی تھی آج بھی ایرانی زبانوں مثلاً روسی، جرمن، فرنچ، انگلش، لاطینی، یونانی، نیز سنسکرت اور ہندی وغیرہ کے خطوط کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کے تمام حروف کی شکلوں کی ساخت پیکان یا کیل سے مشابہ ملتی ہے۔ ایک سے چار کیلوں تک خاص خاص طریقوں سے ترکیب دے کر ان کی جداگانہ شکلیں بنتی ہیں۔ تمام قدیم فارسی زبانیں دساتیری، زندی، پہلوی وغیرہ اس خط میں لکھی جاتی تھیں۔

اسلام لانے کے بعد اہل فارس نے اپنی زبان کو عربی خط میں لکھنا شروع کیا اور خط تعلیق کو جو عوام میں رائج تھا اختیار کر لیا۔ فارسی کی سب سے پہلی تحریر جو عربی خط میں ملی ہے وہ ایک بیعنامہ ہے جو سنہ۳۱ھ میں لکھا گیا تھا اس کے بعد بیہقی کی تاریخ ہے جو خود مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نیشاپور میں دستیاب ہوئی ہے۔ اس کی کتابت کا زمانہ تقریباً سنہ۴۰۰ھ ہے۔

ایرانیوں نے خط تعلیق کو بتدریج ترقی دینی شروع کی اور خط نسخ اور تعلیق دونوں کو باہم ملا کر خط نستعلیق نکالا۔ ہزاروں خطاط اور خوشنویس پیدا ہوئے اور ایرانیوں کی لطافت طبع نے اس خط کو اس قدر دیدہ زیب اور دلفریب بنا دیا کہ اس سے بڑھ کر خوشنما کوئی خط روئے زمین پر نہیں ہے۔ تمام کتابیں اسی میں لکھی جاتی ہیں۔ مذہبی کتابوں کیلئے خط نسخ اور روزمرہ کے کاموں میں خط شکستہ مستعمل ہے۔ نقوش میں خط گلزار بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ اسی ایرانی خط نے افغانستان اور ہندوستان میں رواج پایا اور ان ممالک میں بھی بے نظیر خوشنویس پیدا ہوئے۔

فارسی حروف تہجی میں عربی کے حروف تہجی پر چار حرف اور اضافہ کئے گئے یعنی پ، چ، ژ، اور گ۔

بلوچی۔ بلوچستان اور مکران میں بولی جاتی ہے۔ فارسی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ مذہبی زبان میں عربی کے الفاظ اور تجارتی زبان میں اردو کے الفاظ زیادہ شامل ہوگئے ہیں۔ حروف تہجی وہی ہیں جو اردو میں ہیں۔

پشتو۔ افغانستان اور اس کے متصل پہاڑی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ فارسی اور عربی کے الفاظ کثرت سے ملے ہوئے ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی سے قبل کی کوئی تصنیف اس زبان میں نہیں ملتی، لیکن اس کے بعد بہت سی کتابیں نظم و نثر میں لکھی گئی ہیں۔ عربی حروف تہجی سے ۱۲ حروف اس میں زائد ہیں۔

کردی۔ کردوں کی زبان ہے جن میں سے سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح جنگ صلیبی جیسا فخر روزگار پیدا ہوا۔ یہ زبان کردستان اور آرمینیا وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد پندرہ لاکھ کے قریب ہے۔ عربی، فارسی اور ترکی تینوں زبانوں کے الفاظ اس میں کثرت سے شامل ہیں۔ فارسی حروف تہجی سے ایک حرف ڤ جس پر تین نقطے لگائے جاتے ہیں اور جس کی آواز واو کے مشابہ ہے اس میں زیادہ ہے۔ کردی زبان غالباً جب سے کتابت میں آئی ہے

عربی ہی خط میں لکھی جاتی ہے۔

ہندی زبانیں ہندوستان میں متعدد زبانیں مستعمل ہیں لیکن اس ملک کی عام زبان اردو ہے جو تقریباً تمام ہندوستان میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ ہندی، ترکی، فارسی اور عربی الفاظ اس کے اجزاء ترکیبی ہیں۔ اب انگریزی کے رواج سے بہت سے یوروپین الفاظ بھی اس میں داخل ہو گئے ہیں۔

یہ زبان جب سے عالم وجود میں آئی ہے اسی وقت سے عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے حروف تہجی میں فارسی کے حروف تہجی سے تین حروف ٹ، ڈ، ڑ زیادہ ہیں۔

اس زبان میں مسلم اور غیر مسلم قوموں کے اخبارات اور رسالے حد شمار سے زیادہ شائع ہوتے ہیں اور ہر سال ہزاروں کتابیں نظم و نثر میں تصنیف و تالیف ہوتی رہتی ہیں۔

کشمیری۔ خطہ کشمیر کے باشندے بولتے ہیں جن کی تعداد تیس لاکھ ہے۔ پانچویں صدی ہجری کے آغاز ہی سے کشمیر میں اسلام آگیا تھا۔ اسی وقت سے یہاں کی زبان عربی خط میں لکھی جانے لگی۔

ان زبانوں کے علاوہ پنجابی، سندھی، ملتانی وغیرہ بھی ہندوستان کی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔ سندھی زبان میں حروف تہجی کی تعداد ۵۲ تک پہنچتی ہے۔

جزائر بحر ہند کی زبانیں۔ جاوا، سماترا، نیز ریاست ہائے ملایا کی تمام زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔ کسی زمانے میں جنوبی عرب کے تاجر یہاں آئے تھے ان کے اثر سے یہاں کے لوگ اسلام لائے اور عربی خط کو اختیار کر لیا۔

ملائی زبان میں سنسکرت کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اس زمانے کے بقایا ہیں جب ہندوستان اور ملایا میں تجارت کا سلسلہ تھا۔ نیز پرتگالی الفاظ بھی اس میں ملتے ہیں جو پرتگالیوں کے تسلط کی یادگار ہیں۔ عربی حروف تہجی سے پانچ حروف اس میں زیادہ ہیں۔ اعداد کی رقمیں بھی عربی میں لکھی جاتی ہیں۔

جاوی زبان دراصل ملائی زبان کی ایک شاخ ہے اس کی متعدد قسمیں ہیں اور سوائے صولو کے سب عربی ہی خط میں لکھی جاتی ہیں۔ البتہ حروف کی آواز میں عربی تلفظ سے بہت کچھ مغائرت ہے۔ صولو زبان کی الف، ب، قدیم ہندی سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن اب ہالینڈ کی حکومت اس کو مٹا کر ہالینڈی حروف میں لکھوانے کی کوشش کر رہی ہے۔

سماترا میں بھی عربی ہی خط میں کتابت ہوتی ہے صرف منیغ کے باشندے ہندی نما خط میں لکھتے ہیں۔

جزیرہ فلپائن کی زبان۔ فلپائن میں اسلام کی اشاعت ۱۴۷۵ء سے شروع ہوئی۔ اب وہاں کی آبادی کا خاصا حصہ اہل اسلام کا ہے وہ لوگ اپنی تمام کتابیں وہاں کی ملکی زبان مجندنا میں عربی خط میں لکھتے ہیں۔

چینی زبان۔ چینی میں اسلام اگرچہ بہت زمانے سے شائع ہے، اور وہاں مسلمانوں کی آبادی بھی زیادہ ہے لیکن علوم اسلامیہ سے ناآشنا رہنے کی وجہ سے وہاں عربی کا رواج بہت کم ہوا۔ سب سے پرانی عربی تحریر جو چین میں پائی گئی ہے وہ کینٹن کی مسجد کا کتبہ ہے جو ۷۵۱ھ ہجری میں لکھا گیا ہے۔ چینی ساخت کے بعض قدیم مسی ظروف پر بھی عربی نقوش ملے ہیں لیکن ان کے زمانے کی تعیین نہیں ہوسکی۔ غالباً نویں صدی ہجری سے پہلے کے وہ نہیں ہیں۔

چینی مسلمان قرآن شریف، دعاؤں اور بعض مذہبی کتابوں کو عربی خط میں لکھتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں ایک کتاب "مختصر احکام الاسلامیہ" قلمی دستیاب ہوئی ہے جو چینی زبان اور عربی خط میں ہے۔

افریقی زبانیں

افریقہ میں اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان پھیلی اور وہاں کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد اسی زبان کو بولنے اور لکھنے لگی۔ لیکن اس کے علاوہ افریقہ کے مختلف حصوں میں اور زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ مثلاً اقصائے مغرب میں بربری، نوبہ اور سودان مصری میں نوبی۔ وسط افریقہ اور مغربی سوڈان میں زنجی، مشرق اور جنوب میں بانتو وغیرہ اور یہ سب عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

ہم مختصراً یہاں کی چند مشہور زبانوں کا حال ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بربری شلحی۔ حامی زبان کی شاخ ہے۔ مراکش کے اصلی باشندے یہی زبان بولتے ہیں۔

بربری زبان اپنے الفاظ اور تراکیب کے لحاظ سے بذاتِ خود ایک مستقل زبان ہے۔ اس کی دو شاخیں ہیں جو رسم الخط اور تلفظ میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک ریفی جو شمال میں بولی جاتی ہے دوسری سوسی جو جنوب میں مستعمل ہے پھر ان میں سے ہر ایک کی کئی کئی شاخیں ہیں اور سوائے ان صحرائی قبائل کی زبان کے جو توارک کہے جاتے ہیں سب کی سب عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔ توارک کا طرز تحریر حمیری خط سے مشابہ ہے جو زمانۂ قدیم میں جنوبی عرب میں مستعمل تھا۔ اس خط کا وجود انیسویں صدی عیسوی سے قبل نہیں تھا اور یہ مکمل بھی نہیں ہے کیونکہ اس میں اعراب بالکل نہیں۔ زیادہ زمانہ نہ گزرنے پائیگا کہ یہ زبان بھی عربی خط میں آجائیگی۔

بربری قبائلی۔ یہ بھی حامی زبان کی شاخ ہے اور ان غیر عربی قبائل کی زبان ہے جو الجزائر کے نواح میں آباد ہیں۔ اس میں عربی الفاظ کثرت سے ہیں۔ الجزائر میں چونکہ عربی زبان مستعمل ہے اس لئے اسی میں کتابت ہوتی ہے۔ یہ زبان بہت کم لکھنے میں آتی ہے موحدین کے عہد میں جن کا تسلط الجزائر سے اندلس تک ۵۲۴ھ ہجری سے ۶۶۷ھ ہجری تک رہا ہے قرآن شریف اور بعض کتب حدیث وفقہ کے ترجمے اس زبان میں کئے گئے تھے۔ لیکن علمائے وقت نے ان علوم کی تعلیم غیر عربی زبان میں ناجائز قرار دیدی اسی وجہ سے وہ ترجمے فنا کر دیئے گئے۔

ان بربری قبیلوں نے اسلام کی ابتدائی فتوحات میں مسلمانوں کو بہت پریشان رکھا۔ بارہ مرتبہ مسلمان ہو ہو کر مرتد ہوتے

رہے۔ آخری مرتبہ پہلی صدی ہجری کے خاتمہ پر جب موسیٰ بن نصیر کے تسلط میں آئے تو پختہ مسلمان ہوگئے پھر انھیں کے ذریعہ سے وسط افریقہ میں مذہب اسلام کی اشاعت ہوئی اور انھیں لوگوں نے ماورار بحر مغربی ملکوں کو فتح کیا۔

نوبی۔ وادی نیل کے باشندوں کی زبان ہے اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور سب عربی ہی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

حوسی۔ زنجی زبان کی شاخ ہے اور ملک حوسہ میں مستعمل ہے جس کا مرکز سقطو (سکوٹو) ہے اسلئے اس زبان کو بھی سقطو کہتے ہیں۔ عام طور پر تمام افریقہ میں یہ زبان سمجھی جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ الحاق واتصال کی وجہ سے جب افریقہ کی کمزور زبانیں مٹ جائیں گی اور قومی زبانیں ان کی جگہ لے لیں گی تو تمام افریقہ میں صرف چار زبانیں رہ جائینگی۔ شمال میں عربی، مغرب میں حوسی، جنوب میں انگریزی اور مشرق میں سواحلی۔

سواحلی۔ بانتو زبان کی شاخ ہے۔ مشرقی افریقہ اور زنجبار میں بولی جاتی ہے اور افریقہ کے اکثر حصوں میں سمجھی جاتی ہے اہل سواحل و زنجبار ۲۲ ھ سے اسلام سے آشنا ہو گئے تھے اور اسی زمانہ سے عربی دین، عربی اخلاق و آداب اور عربی خط کو اختیار کر لیا۔

ملجاشی۔ جزیرۂ مدغاسکر میں بولی جاتی ہے۔ اس کے بولنے والے تقریباً بیس لاکھ آدمی ہیں۔ اس جزیرہ کے باشندوں میں اسلام قبول کرنے کے بعد کتابت کا رواج ہوا اور چونکہ قرآن سے آشنا ہو چکے تھے اسلئے اسی خط کو اپنی زبان کیلئے اختیار کر لیا۔ اب اس تمام جزیرہ میں یہی خط رائج ہے۔ عربی حروف تہجی میں چند حرف اور بڑھا دیئے ہیں بعض حروف کے تلفظ میں بھی اصل سے اختلاف کرتے ہیں۔

حبشی۔ بلاد حبشہ میں آنحضرت صلعم کے زمانے ہی سے اسلام معروف و مشہور ہو گیا تھا۔ اب وہاں اسلامی آبادی اسی لاکھ ہے۔ گو وہاں کے مسلمان مسیحی سلطنت کے ماتحت ہیں لیکن عقل وادب میں اپنے ہمسایوں سے ممتاز ہیں جبشی زبان کی جسقدر شاخیں ہیں سب کی کتابت عربی خط میں ہوتی ہے —— ان کے علاوہ افریقی زبانوں کی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں۔ مثلاً کوسٹی، سوسو، دنقلی، آنغو، صومالی اور الغالا قبائل کی زبانیں اور یہ سب عربی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

مغربی خط۔ تمام افریقہ میں عربی اور غیر عربی زبانوں کی کتابت میں عربی خط کی جو قسم مستعمل ہے وہ مغربی کہی جاتی ہے۔ یہ دراصل خط کوفی کی ایک شاخ ہے جو پہلے قیروان میں شائع ہوا تھا پھر وہاں سے اندلس میں پہنچا جہاں اس کا نام خط اندلسی یا قرطبی رکھا گیا۔ لیکن قیروانی خط مستطیل تھا اور اندلسی خط نے مدور شکل اختیار کی یہی خط شمالی افریقہ میں شائع ہوا۔

ساتویں صدی ہجری سے وسط افریقہ میں متعدد اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں جن کا مرکز تمبکٹو قرار پایا جو ۶۱۰ھ میں آباد ہوا تھا۔ یہاں اس خط کی ایک دوسری نوعیت پیدا ہوئی جس کا نام خط سوڈانی رکھا گیا۔

اب افریقہ میں چار مختلف قسم کے عربی خط رائج ہیں جو مغربی خط بولے جاتے ہیں:-

خط تونسی یہ خط مشرقی ممالک کے عربی خط سے مشابہ ہے۔ خط الجزائری یہ بالعموم کج اور گوشہ دار لکھا جاتا ہے جس کا پڑھنا

مشکل ہے۔ خط فاسی۔ مراکش کے پایہ تخت کے نام سے منسوب ہے۔ اس کی شکل مدور ہوتی ہے۔ اور چوتھا خط یہی سوڈانی ہے۔

عربی خط اور یورپ

یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات صرف اندلس اور پرتگال تک محدود نہیں رہیں بلکہ فرانس میں وہ دریائے لوارا اور شہر تور تک پہنچ گئے تھے۔ اس مقام سے فرانس کا موجودہ پایہ تخت پیرس صرف ۲۳۴ کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، اس نقطہ پر سے جو خط گذرتا ہے وہ فرانس کو شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے جنوبی حصہ تمام تر دارالاسلام تھا۔

۷۳۲ء کی مشہور جنگ کے بعد جس میں چارلس مارٹل نے مسلمانوں کی پیشقدمی کو روک دیا وہ اس مقام سے طولوز اور قرقسوں کی طرف واپس آگئے اور ایک عرصہ دراز تک فرانس کے اس حصہ میں قرآن شریف اور عربی کی تعلیم ہوتی رہی۔ ۹۲۵ء میں والس کی سمت سے سوئٹزرلینڈ کی طرف بڑھے اور فرانس سے بحیرہ روم کے سواحل تک عربی تسلط قائم ہوگیا۔ اُدھر دوسری طرف سے سسلی اور جنوبی اٹلی پر قبضہ کرتے ہوئے رومۃ الکبریٰ کا محاصرہ کیا اور اس کی بندرگاہ اوستیہ پر قبضہ کرلیا۔ تیرپیا اور جنووا وغیرہ اسلامی علم کے نیچے آگئے اور پوپ کی مقدس تخت گاہ کے ارد گرد عربی دین کی تعلیم اور عربی خط کی کتابت ہونے لگی ـــــ یورپین قومیں جن کو اسلام سے واسطہ پڑا عربی خط میں کتابت کرنے لگیں۔ اندلسی اور پرتگالی زبانیں عربی خط میں لکھی جاتی تھیں اور ان کو انخیادو کہتے تھے۔ عمارات پر نقوش اور کتبے عربی خط میں لکھے جاتے تھے۔ چنانچہ سسلی کے شہر پلرمو میں امپرر فریڈرک دوم کی قبر پر جو کتبہ ہے وہ عربی خط میں ہے۔ اس زمانے کے بلغاریا، جرمنی، نارمنڈی وغیرہ کے سکے ملے ہیں جن پر عربی نقوش ہیں۔ ـــــ عربی خط کا رواج اندلس، پرتگال، فرانس اور اٹلی ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ تمام جزائر بحیرۂ روم میں بھی یہ خط شائع تھا مثلاً جزائر بالیار مایرکا، منارکا، ایویقا نیز کارسیکا اور مالطہ میں بھی۔

مشرقی سمت سے پندرہویں صدی عیسوی میں عثمانی سلاطین نے جب قسطنطنیہ کو جو یورپ کی کنجی ہے فتح کرلیا تو ریاست ہائے بلقان پر ان کا پورا تسلط ہوگیا۔ سترہویں صدی کے وسط میں سلطنت عثمانیہ کے حدود آسٹریا کے پایہ تخت وینا کی دیواروں تک پہنچ گئے تھے اور اس کے رقبہ حکومت میں بحیرۂ ایجین کے جزائر سے لیکر یونان، رومیلیا، بوسینا، ہرزی گوینا، سرویا، مانٹی نیگرو، بلغاریہ، ہنگری، رومانیا، شرقی مالدویا وغیرہ سب داخل تھے۔ ان تمام ملکوں میں ترکی زبان کے ساتھ عربی خط رائج تھا۔ اب بھی ان ممالک میں لاکھوں آدمی ترکی لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بوسینیا اور ہرزی گوینا کے مسلمان جو سلافی النسل ہیں اور جن کی تعداد ۶۱۲۰۰ ہے وہ اپنی سلافی زبان کو بھی اسی خط میں لکھتے ہیں اور وہاں کا اخبار معلم سلافی زبان اور عربی خط میں نکلتا ہے۔

ان تمام حالات کو پڑھ کر یہ واضح ہوجاتا ہے کہ جس طرح دنیا کے مذاہب میں اسلام کو اور زبانوں میں عربی زبان کو غلبہ حاصل ہوا اسی طرح خطوط میں عربی خط کو مقبولیت نصیب ہوئی اور چونکہ اصول کتابت کے لحاظ سے یہ خط دنیا بھر کے خطوں سے زیادہ آسان اور مکمل ہے اس لئے مختلف ملکوں کی مختلف قوموں نے جن کے لب ولہجہ بالکل باہم متضاد تھے اپنی اپنی زبانوں کے لئے بلا دقت اس خط کو اختیار کرلیا۔

اوقاتِ نماز

اوقاتِ صلوٰۃ سے متعلق یہ مضامین کئی مہینوں سے ہمارے پاس رکھے پڑے ہیں۔ اس دوران میں مسئلہ آئین اس انداز سے سامنے آیا کہ ان مضامین کی اشاعت کو معرض التوا میں ڈالنا پڑا۔ اس شمارہ میں ان کو شائع کیا جا رہا ہے، اور ان کی اشاعت کے ساتھ اس بحث کو ختم کیا جا رہا ہے۔ اب اس موضوع سے متعلق مزید مضامین شائع نہیں کئے جائیں گے۔ ہم ان احباب کے شکر گذار ہیں جنہوں نے ہماری دعوت پر اس بحث میں شرکت کی اور اپنے اپنے خیالات پیش کئے۔

سال گذشتہ ہم نے اس بحث کا آغاز محترم خواجہ عباد اللہ صاحب اختر کے مضمون سے کیا تھا جو مئی کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ بحث کی طرح ڈالتے ہوئے ہم نے ارباب علم سے درخواست کی تھی کہ وہ قرآن کی روشنی میں مسلمانوں کے عقائد و معمولات کی تحقیق کریں، اور اپنے نتائج تحقیق کو خالص علمی، سنجیدہ انداز سے بلاکم و کاست ملت کے سامنے پیش کریں۔ ہم جانتے تھے کہ ان نازک مسائل پر ٹھنڈے دل سے گفتگو آسان نہیں کیونکہ قدامت پرست ذہنیتیں ان کوششوں کو غلط معنی پہنا کر عوام کے جذبات کو مشتعل کر دیتی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں جذباتی اشتعال و التہاب کا وافر سامان موجود ہے۔ اس کے باوجود ہمیں توقع تھی کہ ایسے ارباب علم و قلم ہماری درخواست پر ضرور لبیک کہیں گے جو آگ کے ان شعلوں میں بھی خرم رہ سکتے ہیں اور اپنی مساعی کو خالص علمی سواحل میں محدود رکھ سکتے ہیں۔ اب تک ہمیں اس ضمن میں جو کچھ موصول ہوا اسے ہم نے بلاکم و کاست شائع کیا۔ ہمیں مسرت ہے کہ اس نازک مسئلہ کو قابل بحث سمجھا گیا اور اسے زیر بحث لایا گیا۔ لیکن بحث کا عمومی انداز ہماری اس خواہش کی تسکین نہیں کر سکا جس کا اظہار ہم نے آغازِ بحث کے وقت کیا تھا۔

بہرکیف، ابتک بحث اوقاتِ صلوٰۃ سے متعلق رہی ہے۔ اوقات سے متعلق بحث کے دوران میں قدرتی طور پر یہ سوالات بھی پیدا ہوئے کہ صلوٰۃ کی ظاہری ترتیب کیا ہو، اس میں کیا پڑھا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ان سوالات کو ٹالا نہیں جا سکتا، ان کا جواب دینا ہی ہوگا۔ لیکن ہم نے محسوس کیا ہے کہ الصلوٰۃ کی ظاہری شکل و صورت اور تفصیلات و جزئیات پر گفتگو کرنے سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ الصلوٰۃ کے اصول کی وضاحت کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ قرآن کے نزدیک الصلوٰۃ کا تصور کیا ہے اور نظامِ اسلامی (الدین) میں الصلوٰۃ کی حیثیت کیا ہے۔ اس اصل کی تبیین و تشریح کے بعد

فروعات کی توضیح کی ضرورت درپیش ہوگی۔

طلوع اسلام میں نظام صلوٰۃ سے متعلق متعدد مرتبہ اشارے آئے ہیں لیکن اب تک اس پر جو کچھ لکھا گیا وہ محض ضمناً لکھا گیا۔ تصریح و تفصیل سے گفتگو نہیں کی جا سکی۔ چونکہ ضمنی اشارے اس اصول کی کماحقہٗ توضیح نہیں کر سکتے اسلئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس موضوع پر مفصل گفتگو کی جائے اور الصلوٰۃ کے قرآنی تصور کو واضح کیا جائے۔ چنانچہ ہم قارئین کو مژدہ سناتے ہیں کہ ہماری استدعا پر محترم پرویز صاحب نے خرابی صحت اور ہجوم کار کے باوجود وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس موضوع پر مبسوط مضمون طلوع اسلام کو مرحمت فرمائیں گے۔ قارئین اس مضمون کا انتظار فرمائیں۔ طلوع اسلام]

۱۔ (سلطان محمد قریشی صاحب کراچی)

اس عنوان کے تحت جن حضرات کے مضامین اس وقت تک طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکے ہیں ان کو تین گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

اول گروہ خواجہ صاحب محترم اور ان حضرات پر مشتمل ہے جنھوں نے دو نمازیں تحقیق فرمائی ہیں۔ دوسرے گروہ میں داعی الی القرآن صاحب ہیں جنھوں نے تین نمازیں بتائی ہیں۔ تیسرا گروہ پانچ نمازوں کا قائل ہے۔ اس گروہ کی طرف سے کوئی تفصیلی بحث تاحال پیش نہیں ہوئی ہے۔ میری چند سطور (طلوع اسلام مئی ۵۰ء) تو صرف اس غرض سے تھیں کہ وہ آیات بتا دی جائیں جن میں اوقات نماز مذکور ہیں۔ دیگر حضرات نے نہ جانے تفصیلی بحث کو کیوں ضروری خیال نہیں فرمایا۔ غرضیکہ اس موضوع پر اس وقت تک تفصیلی بحث اور مدلل مقالے سپردِ قلم فرمانے کا سہرا خواجہ صاحب موصوف ہی کے سر ہے۔

اب میں اپنے نتائجِ فکر عرض کرتا ہوں۔

"حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ"

اس آیۃ کریمہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ نمازیں دو نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ لفظ "صلوٰت" جمع ہے۔ جمع قلت تین سے نو تک ہوتی ہے۔ دو نمازوں کے لئے "صلوٰتین" ہونا چاہئے تھا۔ اختصار بحث کیلئے کم سے کم تعداد جمع قلت تین لے لیجئے۔ صلوٰۃ الوسطیٰ سے قبل واوِ عطف سے ایک اور نماز کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ گویا اس طرح چار نمازیں ہوئیں۔ لیکن عدد وسطیٰ طاق اعداد میں ہی ہوتا ہے اور چار میں نہیں ہو سکتا اس لئے طاق عدد بنانے اور صلوٰۃ الوسطیٰ قائم کرنے کے لئے ایک قدم آگے جانا لازمی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ معلوم یہ ہوا کہ صلوٰت کا لفظ چار نمازوں کے لئے ہے اور پانچویں صلوٰۃ الوسطیٰ ہے۔ اس کے بعد صرف ان کے اوقات کا قرآن سے تلاش کرنا باقی رہ جاتا ہے خواہ لفظ صلوٰۃ لاکر یہ مفہوم ادا کیا گیا ہو یا دوسرے الفاظ سے۔

دراصل معترضین نے آیۃ $\frac{۲۴}{۵۸}$ میں صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشاء دیکھ کر دوسری آیات میں گہری فکر کی ضرورت محسوس ہی نہیں فرمائی۔

خواجہ صاحب ممدوح نے صلوٰۃ الوسطیٰ کو عدل یا نماز جمعہ فرمایا ہے مجھکو اس خیال سے اتفاق نہیں میرے اعتراضات یہ ہیں:۔

(۱) جن نمازوں کی حفاظت کا حکم اس آیت میں ہے وہ اگر روزانہ نمازیں ہیں تو صلوٰۃ الوسطیٰ بھی ان ہی میں سے ایک ہے، ہفتے کے ساتویں دن یا کسی علیحدہ قسم کی نماز نہیں ہے۔

(۲) عدل کی خصوصیات جو آپ نے بیان فرمائی ہیں وہ بجائے خود تسلیم، لیکن یہ خصوصیات از روئے قرآن ہر نماز سے متعلق ہیں، صرف صلوٰۃ وسطیٰ کے لئے ہی نہیں۔ اس لئے ہر نماز عدل ہے۔

ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشاء الخ

(۳) صلوٰۃ جمعہ کا وجود قرآن سے ثابت نہیں ہوتا (یعنی ہفتہ کے ساتویں دن جس کو جمعہ کہا جاتا ہے) قرآن میں لصلوٰۃ الجمعۃ تو ہے نہیں لصلوٰۃ من یوم الجمعۃ ہے جس کا مطلب جمعہ کے روز نماز کے لئے ہوا نہ کہ جمعہ کی نماز کے لئے۔ جس نماز کو آپ نماز جمعہ تصور فرماتے ہیں اور صلوٰۃ الوسطیٰ کہا ہے وہ دو رکعت کے فرق سے نماز ظہر کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ شرائط وضو، طہارت جسم و لباس اور جماعت سب نمازوں کے لئے ایسی ہی ضروری اور لازمی ہیں جیسا آپ کی مفروضہ نماز جمعہ کے لئے۔

نماز فجر، ظہر اور عشا

یا ایھا الذین اٰمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلٰث مرات من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ ومن بعد صلوٰۃ العشاء ثلٰث عورات لکم (۲۴/۵۸)

یہاں پر فجر اور عشا کی نماز کا ذکر تو واضح الفاظ میں موجود ہے لیکن نماز ظہر کے لئے۔ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ بھی اگر کوئی وقت نماز ہوتا تو لفظ صلوٰۃ تیسری جگہ بھی ضرور ہوتا۔ اس جگہ صلوٰۃ الظہر اگر ہوتا تو نص صریح تو ضرور ہو جاتا لیکن یہ تکرار لفظی اہل زبان کیلئے کسی کشش کا سبب نہیں تھا اور کلام بھی فصاحت سے گر جاتا۔

معترضین نے اپنی تمام بحث میں صریح الفاظ اور واحد و جمع کے استعمال کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے اور فصاحت قرآن کو قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ قرآن کا نزول اس وقت ہوا جبکہ فصاحت عرب عروج پر تھی۔ عرب والے اپنے سوا سب کو عجم (گونگا) کہتے تھے۔ شاعر اپنے قصائد لکھتے اور در کعبہ پر لٹکا کر نعرۂ 'انا ولا غیری' بلند کرتے تھے۔ لہٰذا فصاحت ہی قرآن کا معجزہ اور دعوائے 'فاتوا بسورۃ من مثلہ' کی بنیاد ہے۔ اور اس فصاحت کی وجہ سے ہی کفار عرب کو عاجز آ کر کہنا پڑا تھا 'ما ھذا الکلام البشر'۔ قرآن کا انداز بیان مخصوص ہے۔ اس میں ایک لفظ سے مختلف جگہ جدا معنی بھی لئے گئے ہیں۔ واحد کو جمع کی جگہ بھی لایا گیا ہے مگر نحوی اعتراض کی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔ جدا الفاظ سے ایک ہی معنی بھی لئے ہیں اور اسوۂ حسنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور اوامر بھی بیان کیا گیا ہے۔

آیت بالا میں تین وقت پردے کے بتلائے گئے ہیں اور وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ اس وقت تم کپڑے اتارے ہوتے ہو۔ دو جگہ تو لفظ صلوٰۃ لاکر نماز فجر و عشا کا تعین فرما دیا گیا ہے۔ تیسری جگہ "صلوٰۃ الظہر" نہ ہونا اس امر کی معقول دلیل نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی وقتِ نماز ہی نہیں ہے۔ فجر اور عشا کے ساتھ "صلوٰۃ" کی موجودگی ہی ظاہر کرتی ہے کہ تیسرا وقت بھی نماز کا وقت ہے۔ ورنہ صلوٰۃ الفجر و صلوٰۃ العشا کے بجائے ان دونوں وقتوں کا مفہوم دوسرے الفاظ سے ادا کیا جا سکتا تھا۔ مگر قرآن نے اپنی فصاحت قائم رکھتے ہوئے تیسری جگہ "صلوٰۃ" حذف کر کے اور دو جگہ یہ الفاظ لاکر صاف بتلا دیا ہے کہ تیسرا وقت (ظہر) بھی نماز کا ہی وقت ہے۔

اس آیت پر ذرا اور غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ ان تینوں اوقات میں کپڑے سونے کیلئے اتارے جاتے ہیں، کسی دیگر غرض نہانے وغیرہ کے لئے نہیں۔ جن حضرات نے نمازِ عشا کو نمازِ شام (مغرب) بتایا ہے یہ اصحاب اگر شام کو ہی کپڑے اتار کر میٹھی نیند کے مزے لینے کے عادی ہیں تو شوق سے عشا کو مغرب مانیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ عامۃ الناس تو عام طور پر دس بجے شب کے قریب سونے کیلئے کپڑے اتارتے ہیں اور موجودہ معاشرہ میں تو لوگ سنیما اور کلب وغیرہ میں مشغولیت کے باعث دو تین بجے شب تک سونے کا نام نہیں لیتے۔ عشا کا وقت تو شام سے دو ڈھائی گھنٹہ بعد ہوتا ہے۔ غسق اللیل کی تفسیر بھی یہی ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب تاریکی ہر شے پر مسلط ہو جاتی ہے اور شام کے فوراً بعد ہی ایسا نہیں ہوتا۔ آناءِ اللیل سے بھی یہی مراد ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے مقالے میں کسی جگہ فرمایا تھا "سورج نکلنے اور ڈوبنے سے پہلے دن رات کے چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں۔" غور فرمایا آپ نے اس شاعرانہ فقرہ پر۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سورج کا نکلنا اور ڈوبنا تو شامل ہی ہوتا ہے۔ پھر یہ "سے پہلے" کی پخ سے کیا مطلب۔ شاید قبل الغروب (شمس) کے معنی میں الجھن پیدا کرنا مقصود ہوگا۔ اپنی مصلحت آپ ہی جانیں۔

تسبیح اور صلوٰۃ

گروہ اول و دوم نے صلوٰۃ اور تسبیح کی تفریق کے لئے آیۃ مبارکہ ذیل سے استدلال فرمایا ہے:-

الم تر ان اللہ یسبح لہ من فی السمٰوٰت والارض والطیر صفٰت، کل قد علم صلاتہ وتسبیحہ۔ (۲۴/۴۱)

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ایک آیۃ میں صلوٰۃ الفجر و صلوٰۃ العشا دیکھ لینے کے بعد غالباً ان حضرات نے دوسری آیات میں غور و فکر کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ ورنہ اسی آیت سے عیاں ہو جاتا کہ تسبیح اور صلوٰۃ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ یہ ہے کہ تمام مخلوق جو زمین اور آسمانوں میں ہے (جمادات، نباتات و حیوانات بشمول انسان اور ملائک وغیرہ) تسبیح کرتے ہیں اللہ کی اور ہر ایک جانتا ہے اپنی صلوٰۃ اور تسبیح کو۔ غور فرمایا آپ نے کہ صلوٰۃ اور تسبیح یہاں شرح ہے "یسبح" کی یعنی انسان کی تسبیح اس کی صلوٰۃ ہے جس کا حکم اسی کیلئے ہے۔ اور باقی مخلوق کی تسبیح اس کا ذکرِ الٰہی ہے۔ اگر صلوٰۃ اور تسبیح جدا جدا ہوتیں تو "یسبح" سے قبل "صلاتہ" کے مقابلے میں "یصلی" ضرور ہوتا۔ "اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فسعوا الی ذکر اللہ" سے یہ امر مزید واضح ہو جاتا ہے کہ صلوٰۃ اور تسبیح ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یہاں صلوٰۃ کو ذکر اللہ فرمایا گیا ہے۔ درحقیقت قرآن میں جہاں تسبیح کا حکم وقت کی قید کے ساتھ

دیا گیا ہے مراد نماز کے سوا دوسری چیز نہیں ہے۔ پھر نماز میں تسبیح ہی تو کی جاتی ہے۔

قرأت خاموش

ولا تجھر بصلاتک ولا تخافت بھا وابتغ بین ذالک سبیلا (۱۷/۱۱)

اس آیت کی رو سے کہا گیا ہے کہ نماز ظہر و عصر میں چونکہ قرأت خاموش ہوتی ہے اس لئے یہ نمازیں فرض نہیں ہیں، نوافل ہیں۔ دلیل بظاہر وزندار ہے۔ مگر دین کے ساتھ جو سلوک ملائیت نے کیا ہے جب اس کو دیکھتے ہیں تو یہ اعتراض زیادہ وقیع نہیں رہتا۔ کسی حکم نہی کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب کسی جاری فعل کو روکنا ہوتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ نزول آیتہ کریمہ بالا سے قبل لوگ قرأت بالجہر اور بالخفی دونوں سے نماز ادا کرتے تھے یعنی بعض ایک قرأت سے اور بعض دوسری سے۔ اس آیتہ کے بعد قرأت بین السبیل جاری ضرور ہوئی ہوگی۔ لیکن کچھ لوگ عادتاً اور منافقین بغرض نفاق ان نمازوں کو قرأت خاموش ہی سے ادا کرتے رہے ہوں گے۔ اور زمانہ مابعد میں جہاں اور باتوں میں دین کو بگاڑا گیا اور طرح طرح کی قطع و برید اور اضافے کئے گئے وہاں اس معاملے میں بھی یاران طریقت نہیں چوکے اور قرأت خاموش کو رواج دیدیا۔ بہرصورت جبکہ قرآن پانچ وقت بتلا رہا ہے صرف قرأت کی بنا پر ان نمازوں کو نوافل قرار دینا درست نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ قرأت بین السبیل اختیار کی جاسکتی ہے اس میں نہ کوئی گرفت ہے اور نہ گناہ۔

صلوٰۃ مغرب اور عشار

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل الخ

اس آیت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ صلوٰۃ صیغۂ واحد ہے لہذا یہ وقت ایک ہی نماز کا ہے۔ کہنے کو تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اقم فعل امر صیغہ واحد مذکر حاضر ہے اس لئے اس پر عمل کرنے کے مکلف صرف رسول اکرمؐ ہی تھے اور وہ بھی ساری عمر میں صرف ایک دفعہ ایک ہی نماز ادا کرکے اس فرض سے سبکدوش ہوسکتے تھے۔ اس لئے یہ حکم باقی مسلمانوں کیلئے ہے ہی نہیں۔ لیکن اس قسم کے اقوال بیکار محض ہیں۔

"لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکٰری"۔ یہاں بھی صلوٰۃ واحد ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہوئے کہ ایک نماز تو حالت سکر میں نہیں پڑھ سکتے باقی ادا کرسکتے ہیں۔ دیکھئے یہاں کس طرح واحد سے جمع کا کام لیا گیا ہے۔ دراصل یہ حکم ہر نماز کے لئے ہے اور صلوٰۃ سے مراد ہر نماز (یعنی سب نمازیں) ہے۔ اسی طرح "وامر اھلک بالصلوٰۃ" کیا اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہوسکتا ہے کہ اے رسولؐ اپنے اہل کو ایک ہی نماز کا حکم کرو۔ یہاں بھی صلوٰۃ سے مطلب ہر نماز (یعنی سب نمازیں) ہے۔ قرآنی فصاحت کے بارے میں جو کچھ عرض کرچکا ہوں اس کی متعدد مثالیں قرآن میں موجود ہیں جو واقفانِ قرآن سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ چنانچہ اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل کے معنی ہوئے کہ ہر نماز جو دلوک شمس سے غسق اللیل تک واقع ہو، قائم کرو۔

اب یہ مشہود حقیقت ہے کہ آفتاب کی تپش، تیزی اور چمک جو دوپہر تک ہوتی ہے ظہر کے وقت اس میں قدرے کمی آجاتی ہے

اور یہ صورت عصر تک قائم رہ کر پھر مزید کمی، روشنی اور حدت میں ہو جاتی ہے اور دھوپ کافی پیلاہٹ پکڑ جاتی ہے حتیٰ کہ آفتاب غروب ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ وقت تین نمازوں (ظہر، عصر اور مغرب) کا ہوا مگر بخوف طعن تقلید اور بغرض اختصار بحث ہم دلوک الشمس کے معنی ایک وقت مغرب ہی لے لیتے ہیں جس کو گروہ اول کی طرف سے عشا بتلایا گیا ہے۔ چلئے یہ تو آپ کی اصطلاح میں نماز عشا (شام یا مغرب) ہو گئی۔ رہی غسق اللیل والی نماز جس کو ہم لوگ عشا کہتے ہیں، اس کو آپ جو نام چاہیں دے لیں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ آیۃ کریمہ میں لفظ دلوک آیا ہے۔ نماز شام یا مغرب کیلئے قرآن کا بکثرت مستعمل مانوس لفظ غروب الشمس کفایت کر سکتا تھا۔ دلوک سے یہ مفہوم ادا کرنا ضروری نہیں تھا۔ اس لئے قرینِ صداقت ہی نہیں بلکہ صداقت ہی یہ ہے کہ 'دلوک' دانستہ زوال تا غروب آفتاب کے لئے لایا گیا ہے۔

(۱) فاصبر علیٰ ما یقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبھا ومن اٰنائ الیل فسبح واطراف النھار لعلک ترضیٰ۔ (۲۰/۱۳۰)

(۲) فاصبر علی ما یقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب (۵۰/۳۹)

ہر دو آیات میں تسبیح کا حکم بقید اوقات ہے۔ ہم اوپر بتلا چکے ہیں کہ تسبیح اور صلوٰۃ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ عام ذکر کے لئے وقت کی قید (اگر مراد صلوٰۃ نہیں) بے موقع اور زوائد میں شامل ہے جو فصاحت قرآن کے سراسر منافی ہے۔ خواجہ صاحب نے بھی یہی رائے ظاہر فرمائی ہے کہ عام ذکر تو ہمہ اوقات ہو سکتا ہے۔ اس لئے ماننا پڑتا ہے کہ یہ حکم صلوٰۃ کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ چنانچہ قبل طلوع الشمس (فجر) اور قبل غروب (عصر) ہوئی جو صلوٰۃ الوسطیٰ یعنی درمیانی نماز ہے۔ ومن اٰنائ الیل (رات کے اوقات میں) نماز عشا اور اطراف النھار میں فجر و مغرب۔ اس آیت میں فکر کرتے وقت "ومن" کا لحاظ نہایت ضروری اور اہم ہے۔ آیت (۲) سے بھی فجر و عصر کا وقت نکلتا ہے۔

اقم الصلوٰۃ طرفی النھار وزلفاً من الیل (۱۱/۱۱۴)

اس آیت کریمہ میں زلفاً کے معنی نزدیکی یا قرب لیکر شام کا وقت نکالا گیا ہے۔ یہ معنی اس مقام پر چسپاں نہیں ہوتے اور قواعد زبان اسکی قبولیت سے انکار کرتے ہیں۔ قرب یا نزدیکی کے معنی میں اس کا صلہ 'الیٰ' یا 'لِ' ہوتا جیسا خواجہ صاحب موصوف کی محولہ آیات (طلوع اسلام مئی ۱۹۵۰ء) سے ظاہر ہے۔ لفظ 'من' جو یہاں موجود ہے برائے تبعیض ہے اسلئے 'زلفاً' کا مفہوم 'من' کے مدخول دلیل کا ایک جزو ہونا چاہئے۔ زُلفا جمع ہے زلفۃ کی اور اس کے معنی ہوتے ہیں 'رات کا ایک حصہ'۔ علاوہ بریں 'واؤ' قبل 'زُلفاً' بھی غور طلب ہے۔ اس آیت قرآنی سے کم از کم تین اوقات صلوٰۃ نکلتے ہیں۔ طرفی النھار سے فجر و مغرب اور 'وزلفاً من الیل' سے صلوٰۃ عشا۔

۲۔ (چودھری بشیر احمد صاحب نوری بی۔ اے۔ مقیم کوئٹہ)

نماز زمانۂ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ تمام انبیاءؑ اسلام کے داعی تھے، نماز پڑھتے تھے اور اپنی امتوں کو نماز پر قائم کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ اے میرے رب میری اولاد کو نماز پر قائم کر۔ ربنا لیقیموا الصلوۃ (۱۴/۳۷) ان کے دین کی تبلیغ و اشاعت عرب کے ریگستان میں ان کے مہاجر فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے کی۔ اور پھر تین چار ہزار برس کے بعد ان کے جانشین پوتے حضرت محمد رسول اللہ صلعم نے اسی دعوت کی تجدید و تکمیل کی۔ ملّتا بیکم ابراھیم۔ (تمہارے باپ ابراہیم کا دین)

مشرکین عرب اسی مناسبت سے اپنے آپ کو حنفا کہتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ ملت ابراہیم پر ہیں۔ بعثتِ محمدی سے پہلے ملتِ ابراہیمی کے خیالات، معتقدات اور شعائر کے آثار ان میں باقی تھے۔ احرام حج اور استقبالِ خانہ کعبہ میں دعا کرتے تھے، اور اس کو صلوٰۃ کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی نماز کا قرآن مجید نے اس آیت میں ذکر کیا ہے۔

وما کان صلاتھم عند البیت الا مکاءً و تصدیہ (۸/۳۵)

اور ان (مشرکینِ عرب) کی نماز خانہ کعبہ کے نزدیک نہیں ہے سوائے سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے۔

صابئی حضرت شیثؑ اور ادریسؑ کی پیروی کے دعویدار تھے۔ ان کے ہاں سات وقتوں کی نمازیں اور ایک قمری مہینہ کا روزہ تھا اور جنازہ کی نماز پڑھتے تھے۔

نماز کب فرض ہوئی؟ قرآن کہتا ہے کہ نوع انسانی کا اولین فریضہ نماز ہے۔ حضرت رسول اکرم صلعم کے زمانے میں نماز کی فرضیت کے حکم کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ (۱) آپ بعثت سے پہلے بھی نماز پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے۔ غارِ حرا میں تشریف لیجاتے اور وہیں دو دو شبانہ روز متواتر عبادتِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ (۲) روایت ہے کہ جب آپ مبعوث ہوئے تو ابلیس کو جستجو ہوئی، ہر طرف اس نے اپنے لشکروں کو بھیجا۔ ناگاہ رسول اللہ صلعم بطن نخلہ میں نماز پڑھتے نظر آئے (ابن کثیر)۔ (۳) آنحضرت صلعم کو ابتداءً جو وحی غار حرا میں نازل ہوئی، وہ سورۂ علق تھی۔ اس سورت کی نویں اور دسویں آیتیں یہ ہیں:۔

ارءیت الذی ینھی ہ عبدا اذا صلّٰی (۹۶/۹-۱۰)

کیا دیکھا تو نے اس شخص کو کہ منع کرتا ہے (ہمارے) بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے؟

ان آیات میں نماز کا ذکر (وحی الٰہی میں) پہلی مرتبہ ہوا۔ مگر یہ ذکر بصیغہ امر نہیں۔ یعنی نماز کی فرضیت کا حکم نہیں عملِ نماز اور مشرکین کی مخالفت کی خبر ہے۔ موضح القرآن میں لکھا ہے کہ ابوجہل رسول اکرمؐ کو نماز پڑھتے دیکھتا تو چڑ آتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ اس اول وحی سے پہلے بھی نماز گذار تھے۔

(۴) قرآن میں سورتوں اور آیات کی موجودہ ترتیب علم الٰہی میں مقدر اور الہامی ہے۔ ان میں بھی پہلی دفعہ نماز کا ذکر سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات میں آیا ہے۔ الذین یقیمون الصلوٰۃ (۳/۲) اس میں بھی نماز کا حکم نہیں۔ ہدایت کے مستحقین اور راہِ حق کے متلاشیوں کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ پس بعثت کے بعد آنحضرت صلعم کے سامنے جو سوال تھا وہ بحیثیت رسول و مبلغ و مجددِ دینِ حنیف، یہ تھا کہ نماز کے متعلق قوم میں جو تعطل و خرابی آگئی ہے اس کی اصلاح کی جائے۔

مگر مفسرین کے اقوال فرضیتِ نماز کے متعلق مختلف ہیں۔ مشہور قول یہ ہے کہ نماز شبِ معراج (لیلۃ الاسراء) میں فرض ہوئی۔ بخاری اور دوسری کتب احادیث سب فرضیت نماز پنجگانہ کو شبِ معراج سے وابستہ کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیت سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام الخ (۱۷/۱) کی تفسیر میں تمام مفسرین واقعہ معراج کے ساتھ فرضیت اور تعداد نماز کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ شبِ معراج کو آنحضرتؐ آسمانوں پر گئے اور پچاس نمازیں دن رات میں فرض ہوئیں۔ مگر حضرت موسیٰؑ کے مشورہ دینے سے کئی دفعہ کی تخفیف کی التجا کے بعد آخر پانچ نمازیں رہیں۔ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ ہجرت مدینہ سے تقریباً ایک سال پہلے رسول اللہ صلعم کو اسریٰ کا واقعہ پیش آیا۔ اس لئے یہی سال مفسرین اور علماء کے نزدیک پانچ نمازوں کی فرضیت کا سال ہے۔ موقعہ کی مناسبت سے اسی صورت میں پانچ نمازوں کا حکم ہونا چاہئے تھا۔ مگر اس آیت سے آگے اسی سورت میں جو حکم ہوتا ہے وہ یہ ہے:-

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الی غسق اللیل وقرآن الفجر الخ (۱۷/۷۸)

اور نماز قائم کر سورج کے ڈھلنے سے رات کی تاریکی چھا جانے تک اور صبح کا قرآن۔ الخ

اس میں دن رات میں دو نمازوں اور دو وقتوں کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تاریخ نزول کے لحاظ سے جس آیت میں نماز کے وقتوں اور نماز کی تعداد کا ذکر ہے وہ سورۂ ہود کی آیت ہے جو حسب ذیل ہے:-

اقم الصلوٰۃ طرفی النہار وزلفاً من اللیل (۱۱/۱۱۴)

نماز قائم کر دن کے دونوں طرف اور رات سے ملے ہوئے وقت میں۔

سورۂ ہود اگرچہ مکی ہے مگر مفسرین کے نزدیک یہ آیت مدنی ہے (فہرس ترتیب النزول السور مطابق مصحف حکومت مصر) قرآن مجید نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان نمازوں کے نام بھی خود ہی مقرر کر دیئے ہیں یعنی صلوٰۃ الفجر اور صلوٰۃ العشا۔ چنانچہ سورہ النور جس کا سالِ نزول پانچ ہجری ہے اور مدنی سورت ہے۔ اس کی آیت ۵۸ میں یہ نام گن دیئے ہیں:-

یا ایھا الذین اٰمنوا لیستاذنکم الذین ملکت ایمانکم والذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلث مرات من قبل صلوٰۃ الفجر وحین تضعون ثیابکم من الظہیرۃ ومن بعد صلوٰۃ العشاء ثلث عورات لکم (۲۴/۵۸)

اے ایمان والو! مناسب ہے کہ وہ لوگ جو تمہارے زیردست ہیں اور وہ جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے تم سے تین اوقات میں اجازت لیکر تمہارے پاس آئیں۔ نماز صبح سے پہلے اور دوپہر کے وقت جب تم کپڑے اتار رکھتے ہو اور نماز عشا کے بعد۔ یہ تین وقت تمہارے پردے کے ہیں۔

اس سے واضح ہو جائے گا کہ احادیث کے مطابق پانچ نمازوں کے فرض ہونے کے بعد بھی قرآن مجید میں دو نمازوں کا حکم ہے۔ تیسری نماز صلوٰۃ الجمعہ سورۂ جمعہ کی آیت یا ایھا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ (۶۲/۹) بھی مدنی ہے یعنی ۲ھ ہجری۔ نماز جمعہ کا ذکر قرآن مجید میں اسی اہتمام سے ہے جس طرح اور دو فرض نمازوں کا پانچ نمازوں کے فرض ہونے سے پہلے یعنی نبوت و رسالت کے پہلے دس سالہ دور میں ہمیں قرآن مجید میں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جس میں صلوٰۃ کے وقتوں اور ان کی تعداد کا ذکر ہو، سوائے سورۂ فرقان (مکی) کی ذیل کی آیت کے جس میں قرآن مجید کے صبح اور شام پڑھے جانے کا ذکر مشرکین کے حوالے سے ہے:۔

قالوا اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملیٰ علیہ بکرۃ واصیلاً (۲۵/۵)

اور کہا انھوں نے یہ کہانیاں ہیں پہلوں کی کہ لکھ لیا ہے ان کو۔ پس وہ پڑھی جاتی ہیں اوپر اس کے صبح اور شام۔

اس آیت کے متعلق موضح القرآن میں لکھا ہے "اول نماز کا وقت مقرر تھا صبح اور شام" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مکہ میں دو نمازیں ہی فرض تھیں مفسرین کو یہ امر تسلیم ہے۔ جیسا کہ ذیل کے اقتباس سے ظاہر ہے:۔

ابتدائے فرضیت نماز کے متعلق مفسرین کا بیان ہے کہ وہ صبح و شام کی دو رکعتوں تک محدود تھی۔ وسبح بحمد ربک بالعشی والابکار (اور اپنے رب کی حمد کی تسبیح شام و صبح پڑھ) اور عبادت شب صرف تلاوت قرآن کا، جیسا کہ سورۂ مزمل کی ابتدا میں مذکور ہے، نام تھا۔ باقی پنجگانہ نماز تو ہجرت سے کچھ دنوں پہلے فرض کی گئی (تاریخ فقہ اسلامی اردو ترجمہ تاریخ التشریع الاسلامی مولفہ علامہ محمد الخضری مرحوم)۔

آیاتِ تسبیح خالی الذہن شخص کے لئے نماز کے اوقات اور تعداد کے متعلق صاف صاف ہدایات موجود ہیں۔ مبادیاتِ نماز (مثلاً وضو کا طریقہ وغیرہ) کے احکام تو قرآن میں موجود ہوں مگر اوقات درکعتیں نہ ہوں۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ مگر مفسرین ان آیات کی تفسیر میں جن میں تسبیح کا ذکر بقید اوقات آیا ہے، پانچ نمازیں گن دیتے ہیں۔ حالانکہ ان آیاتِ تسبیح میں ایسی کوئی آیت نہیں جس سے پانچ مروجہ نمازیں اور وقت پورے اتریں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ایسی آیتیں جن میں دو سے زیادہ اوقات تسبیح بیان ہوں سورۂ بنی اسرائیل (پانچ نمازیں فرض ہونے سے) پہلے زمانے کی ہیں۔ مثلاً

(۱) سورۂ قٓ (مکی) کی آیت:۔

فاصبر علی ما یقولون وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود (۵۰/۳۹)

(ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی) سو ان کی باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے۔ (اس میں نماز بھی داخل ہے)۔ آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً صبح کی نماز) اور چھپنے سے پہلے (مثلاً ظہر و عصر) اور رات میں بھی اس کی تسبیح کیا کیجئے (اس میں مغرب اور عشا آگئی) اور (فرض) نمازوں کے بعد۔

تمام تراجم میں ادبار السجود کا ترجمہ یا مفہوم "نماز کے پیچھے" ہی دیا گیا ہے۔ موضح القرآن میں ہے "یعنی نماز کے بعد"۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب پانچ نمازیں گنی جا چکیں تو اب فرض نمازیں کونسی رہ گئیں جن کے بعد تسبیح کا حکم ہے۔ اس آیت سے واضح ہو گیا کہ نماز جس کو شریعت نے فرض کیا ہے اور چیز ہے اور تسبیح اور چیز جس کا حکم فرض نمازوں کے بعد ہے۔

(۲) سورہ طٰہٰ (مکی) کی آیت ہے:۔

فاصبر علی ما یقولون وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ومن اٰنائ اللیل فسبح واطراف النهار لعلك ترضیٰ (۲۰/۱۳۰)

(ترجمہ تھانوی) سو (جب عذاب کا آنا یقینی ہے تو) آپ ان کی (کفر آمیز) باتوں پر صبر کیجئے اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ (اسکی) تسبیح کیجئے (اس میں نماز بھی آگئی) آفتاب نکلنے سے پہلے (مثلاً نماز فجر) اور اس کے غروب سے پہلے (مثلاً نماز ظہر و عصر) اور اوقات شب میں (بھی) تسبیح کیا کیجئے (مثلاً نماز مغرب و عشا) اور دن کے اول و آخر میں تاکہ (آپ کو جو ثواب ملے) آپ (اس سے) خوش ہوں۔

ترجمے میں تفسیری اضافے قابل غور ہیں۔ پانچ نمازوں کا شمار ہو چکا مگر ابھی اطراف النہار (دن کے اول و آخر) کو کسی اور نماز پر چسپاں کرنا چھوڑ دیا گیا ہے۔ اطراف جمع کا صیغہ ہے اور کم سے کم تین نمازوں پر دلالت کرتا ہے۔ ان تین نمازوں کا اور اضافہ کر لیجئے اور ان کے نام بھی تجویز کر لیجئے۔ اب آٹھ نمازیں کم از کم ہو گئیں۔ زیادہ نکالنا چاہو تو گنجائش ہے۔ مولانا محمد علی صاحب نے تو یہ کہہ دیا کہ دو نمازیں نفلی مراد ہیں۔ یہ یاد رکھئے کہ پانچ نمازیں مفسرین کے قول کے مطابق ہجرت سے ایک سال پہلے فرض ہوئیں اور اس سے پہلے دو نمازیں فرض تھیں (حوالہ اوپر گذر چکا) اور سورۂ طٰہٰ جس میں یہ آیت آئی ہے ہجرت سے پانچ سال قبل نازل ہوئی تھی۔ اس معمہ کا حل ہمارا کام نہیں۔ اگر ہم سے پوچھو تو معاملہ آسان ہے یعنی احادیث اور روایات کو قرآن کے تحت رکھ کر ان کی تاویل کیجئے اور قرآن اور حدیث میں تطابق دیجئے۔ یعنی دو نمازیں فرض اور باقی نفلی نمازیں جو عبادت کی وسیع تر اصطلاح میں سما جاتی ہیں۔

(۳) ایک اور مکی سورۃ رہ گئی جس کی آیات ۱۷ و ۱۸ میں چار وقتوں کا ذکر ہے:۔

فسبحٰن اللہ حین تمسون الخ (۳۰/۱۷-۱۸) اس میں چار وقتوں (تمسون، تصبحون، عشیا اور تظہرون) میں یاد الٰہی کا ذکر ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے پہلے دو حوالوں کی طرح ان آیات کے ترجمے میں نمازیں شمار کرنے کی کوشش نہیں فرمائی۔

پانچ نمازیں (بقول محدثین) فرض ہونے کے بعد جو آیات تسبیح نازل ہوئیں ان میں دو وقتوں کا ہی ذکر ہے۔ اور اگر تسبیح سے

مراد نمازیں ہیں تب بھی دو نمازیں ہی ثابت ہوتی ہیں۔

(۱) یا ایھا الذین .... سبحوا بکرۃ واصیلا (۳۳/۴۲) یہ آیت سورۂ احزاب (مدنی) کی ہے جس کا سال نزول ۵ھ ہجری ہے۔

(۲) انا ارسلنک .... وسبحوا بکرۃ واصیلا (۴۸/۹) یہ آیت سورہ فتح (مدنی) کی ہے اس کا سال نزول ۶ھ ہجری ہے۔

الصلوۃ الوسطیٰ اس نماز کے متعلق مفسرین نے ستر۷۰ اقوال نقل کئے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی نے کہا کہ اس سے نماز فجر مراد ہے۔ کسی نے کہا کہ نماز ظہر۔ کسی نے نماز عصر کہا۔ کسی نے کہا نہیں اس سے مغرب مراد ہے۔ کسی نے کہا یہ عشاء کی نماز ہے۔ یقین کا درجہ کسی کو حاصل نہیں۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

یہ خیال آرائیاں اس لئے ہوئیں تاکہ روایات کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اگر قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کیا جاتا تو حقیقت کا سراغ مل جاتا۔ قرآن مجید تصریف الآیات سے اپنی تفسیر خود کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ انظر کیف نصرف الایات لعلھم یفقھون (۶/۶۵) چنانچہ صلوۃ الوسطیٰ کے معنی کی دوسرے مقامات سے وضاحت ہوتی ہے۔ صلوۃ الوسطیٰ کا ذکر سورۂ بقر میں ہے:۔

حافظوا علی الصلوات والصلوٰۃ الوسطیٰ وقوموا للہ قنتین (۲/۲۳۸)

اپنی نمازوں کی حفاظت کرو۔ اور نماز وسطیٰ کی۔ اور کھڑے ہو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے۔

اسی مضمون کی ایک آیت سورۂ المومنون میں ہے:۔

قد افلح المومنون الذین ھم عن صلاتھم خاشعون ..... والذین ھم علی صلوٰتھم یحافظون (۲۳/۱-۹)

بلاشبہ ایمان لانے والے کامیاب ہوئے۔ جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع رکھتے ہیں ..... اور اپنی نمازوں کی حفاظت میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں مشابہت تام ہے۔ دونوں آیتوں میں ایک جگہ نمازوں (بصیغہ جمع) کی حفاظت (یعنی ظواہر صلوٰۃ) کا ارشاد ہے۔ دوسری جگہ دونوں آیتوں میں صلوٰۃ بصیغہ واحد آتا ہے اور الوسطیٰ کے مقابلے میں خاشعون آیا ہے۔ یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کی تشریح کرتے ہیں۔ الوسطیٰ تفضیل کل مونث بروزن فُعلیٰ ہے یعنی بہترین نماز۔ فاضل ترین جو خشوع و خضوع نیازمندی اور عجز سے مملو ہو۔ یہی حقیقت صلوٰۃ اور روح نظام صلوٰۃ ہے۔ اسی کو قائم کرنے کے لئے ہم مکلف ہیں۔ مزید تشریح کے لئے وسط کے معنی پر آیت ذیل میں غور کرو۔

کذلک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس الخ (۲/۱۴۳)

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت بیچ کی یعنی بہتر۔ تو کہ ہو تم گواہ اوپر لوگوں کے۔

ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحبؒ دہلوی کا ہے۔ مولوی محمد علی صاحب اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن میں Ar.-Eng.-Lexicon, by Lane اور مفسرین رازی، کشاف، ابوحیان رضی اللہ عنہم کے حوالے سے وسط اور وسطیٰ کی تشریح میں لکھتے ہیں:۔

وسط Equitable, exalted — The best part of a thing

اور صلوٰۃ الوسطیٰ The best or the most excellent prayer

میں نے چند تاریخی شواہد پیش کر دیئے ہیں۔ آیات صلوٰۃ کی لغوی اور معنوی تشریحات محترم خواجہ عباد اللہ صاحب اختر کے مقالات مئی اور جولائی گذشتہ کے شماروں میں قارئینِ طلوعِ اسلام کے سامنے آچکے ہیں۔ ان کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔

۳۔ (خواجہ عباد اللہ اختر صاحب)

طلوعِ اسلام بابت ماہ اکتوبر ۵۰ء میں دو حضرات نے میرے مقالہ پر جو زیرِ عنوان "الصلوٰۃ" شائع ہو چکا ہے تنقید فرمائی ہے، یہ امر نہایت مستحسن ہے کہ کسی عقیدہ کو عقلی بصیرت دیکھا جائے، لیکن یہ امر مذموم ہے کہ کسی عقیدہ کی بے جا حمایت کی جائے۔ رہا دلائل کا معاملہ تو

عقل ہر چند جز فضائل نیست جہل ہم خالی از دلائل نیست

بحث کا میدان تو ہمیشہ عریض و طویل ہی رہتا ہے، اور اس میں جولانی طبع کے لئے بیشمار راہیں ہیں۔ میں نے تو صرف نصوص قرآنی ہی پیش کی تھیں، اور تفسیر بھی قرآن ہی کی آیات سے کی۔ اب دیکھئے کہ اس جواب میں کس منطقی مغالطہ سے کام لیا جاتا ہے، یہ کہ صلوٰۃ اور تسبیح اور ذکر اور تحمید وغیرہ سب مختلف الفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ مجھ میں تو اتنی ایمانی جرأت نہیں کہ اللہ میاں کو کہوں کہ اتنے الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں اور خواہ مخواہ لوگوں کو الجھن میں ڈال رکھا ہے۔ ایک طالب علم جو علم الالسنہ کے مبادیات سے واقف ہو جانتا ہے کہ کسی زبان میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ کبھی ایک ہی معنی میں استعمال نہیں ہوتے۔ ان کے مفہوم اور استعمال میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے اور قرآن تو مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام بلفظہٖ ہے۔ اس کے الفاظ ایسے ہی محفوظ ہیں جیسے معانی۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ حق ان حضرات کو کس نے دیا ہے کہ صلوٰۃ بمعنی تسبیح وغیرہ اور حرف "الی" بمعنی "مع" استعمال کریں۔ حضرت انسان کو خداداد عقل و فکر ہی سے کام لینا پڑے گا۔ میں نے واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ صلوٰۃ میں عبادات کی ہر ایک صورت کی جھلک نظر آئی ہے۔ اس میں تسبیح وغیرہ سب

شامل ہیں لیکن تسبیح ہو یا ذکر یا تحمید سب کی الگ الگ اپنی صورت ہے اور باوجود اشتراک وجامعیت صلوٰۃ کے بھی اپنی الگ صورت ہے۔ اجتماعی رنگ کے علاوہ وضو وتیمم اور پاکیزگی لباس اور دیگر امتیازی امور بھی اس کی صورت کے خط وخال ہیں۔ اگر ہم ذرا عقل سے کام لیں اور اپنے ہی نظام معاشرت پر نظر کریں تو یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ وضو وغیرہ آداب مجلس کے لوازمات ہی ہیں اور علاوہ ازیں ہمیں ظاہری اور باطنی پاکیزگی کا سبق بھی دیا گیا ہے جو انفرادی حالت میں بھی پسندیدہ ہے۔ اور اگر محض ظاہر پرستی مدنظر ہو تو یہ حقیقت بھی ثابت شدہ ہے کہ صلوٰۃ کا مقصد ہی "تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر" (۲۹/۴۵) ہے، باقی سب انسانی صفت۔ یہ میں نہیں کہتا بلکہ ارشاد الٰہی ہے کہ "واللہ یعلم ما تصفون"۔ یہ صفت خواہ انتہائی محمود ہو صفت ہی ہے۔ اور یہ تو تمام فقہا اور ائمہ دین بھی کہتے ہیں کہ صلوٰۃ بعض حالات مرض میں بلا قیام در کرع وسجود اور بحالت جنگ پشت اسپ پر اور بلا رکوع وسجود جب پیدل ہوں ہو سکتی ہے۔ ان سب صورتوں کا مذکور قرآن ہی میں آچکا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور سہولت فرائض میں یہ بھی ہے کہ تعداد صلوٰۃ روزانہ دو ہیں اور ہفتہ میں تیسری صلوٰۃ یوم الجمعہ ہے۔ اور اس تیسری صلوٰۃ کی حفاظت پر خاص زور دیا گیا ہے کہ اگر روزانہ دو کی حفاظت کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو صلوٰۃ یوم الجمعہ کی تو ضرور ہونی چاہیئے۔ روزانہ دو نمازیں آپ اپنے گھروں میں اور سفر وحضر میں تنہا پڑھ سکتے ہیں اور پڑھتے رہیں۔ اگرچہ بلا عذر معقول ناغہ سب ہے مگر صلوٰۃ یوم الجمعہ کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ جماعتی صورت ہی میں فرض ہے۔ اگر ہم روح اجتماع کے فلسفہ سے واقف ہیں اور ہماری عبادات میں یہی روح کارفرما ہے تو بحث تحصیل حاصل ہے۔ اگر آپ کو خدا نے توفیق دی ہے اور آپ کا ذوق وشوق عبادت اس حد تک ہے کہ آپ کا اطمینان قلب پانچ نمازوں سے ہوتا ہے تو کس کافر نے آپ کو منع کیا۔ گفتگو تو فرائض میں ہے جن کو ہر ایک شخص سہولت ادا کر سکتا ہے۔ اگر آپ نماز کی حقیقت سے واقف ہیں تو آپ کا ایک سجدہ ہزار نمازوں سے بہتر ہے جو محض رسماً ادا کی جاتی ہیں۔ باتیں بنانا تو ہر ایک شخص جانتا ہے، آپ اپنے دل کو ٹٹولیں اور جواب دیں کہ کیا آپ کی نماز کا اثر اس نے کبھی قبول کیا ہے؟ ایک دن، ایک ماہ، ایک سال تو بہت نہیں، مدت العمر میں، کیا آپ کو بوقت نماز یہ بھی شعور ہوتا ہے کہ آپ کسی کے حضور کھڑے ہیں، اور "برزباں تسبیح اور در دل گاؤ خر" کے سوا کچھ اور بھی آپ کی نماز ہے؟

آیہ "فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرا" بطور حجت پیش کرتے ہوئے اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ صلوٰۃ اور ذکر ایک ہی ہے عجیب منطق ہے، حالانکہ اسی پیش کردہ آیت میں اس مفروضہ کی تردید موجود ہے کہ صلوٰۃ کی صورت اجتماعی ہے اور ذکر کی انفرادی اور قضاء صلوٰۃ الجمعہ کے بعد جبکہ شغل تجارت بھی ہو ذکر ممکن ہے۔

"رجال لا تلھیھم ولا بیع عن ذکر اللہ" (۲۴/۳۷) اور صلوٰۃ جمعہ کے بارہ میں تو نص موجود ہے کہ "ذروا البیع"

عجیب تر منطق یہ ہے کہ "ذروا البیع" بطور حجت پیش کرتے ہوئے یہ دعویٰ ہے کہ "صلوٰۃ جمعہ کا وقت قرآن میں بصراحت مذکور نہیں"

یہ لدلوک سے ہی لیا گیا۔" بیع کا تعلق معاشیات سے اور فکرِ معاش کا وقت نہار" وجعلنا النہار معاشا" (۷۸/۱۱) اتنا تو صراحتاً معلوم ہو گیا کہ نماز جمعہ کا وقت نہار ہے۔ نہار کھلا وقت ہے اور ہر ایک نماز کا اول و آخر وقت بھی ہے۔ اگر نہار میں کوئی اور نماز بھی فرض ہوتی تو چونکہ فکرِ معاش ہی مانع ہے اس لئے اسی نماز کے بارہ میں بھی یہی ہدایت ہوئی کہ " ذروا البیع" چونکہ کسی اور نماز کے بارہ میں ایسا کوئی حکم نہیں اس لئے نہار میں کوئی اور نماز فرض بھی نہیں۔ اگر کوئی اور قرینہ آپ کسی آیت سے اخذ کر سکیں تو واضح کرنا چاہئے۔ "دلوک" پر میں کافی بحث کر چکا ہوں جب آپ تسلیم کرتے ہیں کہ نماز جمعہ کا وقت صراحتاً قرآن میں موجود نہیں تو "دلوک" سے یہ صراحت کہ اس کا وقت نہار ہے اخذ کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ اور اگر آپ کا مفروضہ صحیح بھی ہو تو نماز جمعہ روزانہ ہونی چاہئے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لئے کہ اس کا بدل ظہر ہے، عصر و شام آپ کے عقیدہ کے مطابق جو "دلوک" سے اخذ کیا گیا ہے کیوں نہ ہوا ایسا سوال ہے کہ اس کا جواب اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ اپنے عقیدہ "دلوک" سے پہلے دست بردار ہوں، اس کے بعد آپ کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ آپ "دلوک" کے معنی وہی تسلیم کریں جو میں اپنے مقالہ میں واضح کر چکا ہوں۔

"اطراف النہار" میں اطراف جمع کثرت ہے، لیکن ان میں تسبیح کی ہدایت ہے۔ پہلے یہ ثابت کریں کہ تسبیح اور صلوٰۃ ایک ہی ہے لیکن جب قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ ان میں سے دو طرف صلوٰۃ کے لئے مخصوص ہیں خواہ آپ کے مفروضہ کے مطابق اطراف النہار نہار میں داخل ہوں جو قطعاً غلط ہے۔ پھر بھی آپ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ کسی شے کے اطراف اس شے کے حدود ہیں جو اس شے پر محیط ہوں یا جس ماحول میں یہ واقع ہو۔ مثلاً کراچی کی مغربی حد بحیرۂ عرب ہے۔ اطراف سے کسی شے کا مقام یا محل وقوع معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نہار ایک وقت ہے اور وقت ذہنی طول ہی طول ہے اس میں عرض نہیں ہے، اس کے اطراف وہ ہیں جن کو ہم سحر اور شام کہتے ہیں۔ ماہ صیام میں آپ کو "سحری" سے سابقہ پڑا ہوگا جبکہ پو پھٹنے کو ہوتی ہے، خیط الاسود عربی میں اسی وقت کو کہتے ہیں۔ اس کے بعد خیط الابیض وقتِ فجر ہے جو صبح کے بعد آتا ہے، یہ کھلا وقت ہے تا طلوع آفتاب۔ جس کے ساتھ نہار کا وقت شروع ہو جاتا ہے تا غروب آفتاب۔ اس کے بعد عشا کا وقت ہے تا "غسق اللیل"۔ فجر و عشا دو اوقات ایسے ہیں جن کا اطلاق لیل و نہار پر نہیں ہوتا جو معاش و آرام کے اوقات ہیں۔ قرآن نے تو اطراف کے نام بھی بتا دیئے ہیں آپ بہ تعلق صلوٰۃ کوئی نئے تجویز کریں اس پر بھی اگر آپ یہ ثابت کریں نہار اور لیل میں اور نمازیں بھی فرض ہیں تو ہم بھی جھک کر سلام کریں گے۔

یہ مفروضہ کہ "الیٰ" بمعنی "مع" ہے بحث کا موضوع نہیں ہو سکتا جب تک آپ یہ ثابت نہ کریں کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے یا آیت "الی غسق اللیل" میں کوئی قرینہ اس مفروضہ کا موجود ہے۔ اور اگر آپ کا مفروضہ تسلیم بھی کیا جائے تو مع کا وہ مفہوم نہیں ہے جو آپ نے تراشا ہے۔ "ان اللہ مع الصابرین" آپ کے مفروضہ کے رو سے اللہ بندہ، اور بندہ اللہ بن جائے گا۔

"لا تاکلوا اموالھم الی اموالکم" (۴/۲) میں حرف "الیٰ" مع کے معنی میں استعمال

نہیں ہوا۔ حرف "الی" ایک حرکت ظاہر کرتا ہے اور حرکت مقامات کی تبدیلی ہوتی ہے۔ مفہوم آیت یہ ہے کہ یتامیٰ کا مال سرپرست کے لئے حرام ہے اور سرپرست کا اپنا مال اس کے لئے حلال، تو سرپرست کو ایسی حرکت سے باز رکھا گیا ہے جو حرام کو حلال کے مقام تک لے آئے۔ اس لئے یتامیٰ کے مال کو الگ رکھتے ہوئے اس میں اسراف اور بدارے بھی منع کیا گیا ہے۔ جو سرپرست اپنے مال میں تو کرسکتا ہے اگرچہ یہ بھی مذموم ہے۔ "فاغسلوا ایدیکم الی المرافق" میں بھی حرکت واضح ہے یعنی ہاتھوں کے غسل کے بعد کہنی کی طرف آنا، مرافق لفظ "افق" سے مشتق ہے اور افق کے معنی ہی میں معیت ہے الیٰ میں نہیں جسے ہم ہندی میں "جوڑ" کہتے ہیں۔

معلوم نہیں کہ آیہ "ضربتم فی الارض الایہ" کے کس لفظ سے نہار کا مفہوم پیدا کیا ہے۔ نمازیں تو آپ کے عقیدہ کے مطابق پانچ، اور ان میں سے میرے ایمان کے مطابق دو فرض ہیں۔ سفر اور حضر میں یہی پڑھی جائیں گی، ان میں قصر اس وقت ہوگی "ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا" جب سفر میں دشمن کا خوف نہ ہوگا تو یہ رعایت کا حکم بھی ساقط ہو جائے گا اس لئے اوقات و تعداد صلوٰۃ کا تعلق سفر و حضر سے نہیں جو صرف دو حالتیں ہیں۔ وہ تو بہرحال ہمارے نظریے کے مطابق انہی اوقات اور انہی تعداد میں ہیں جو ہم تسلیم کرتے ہیں۔ آپ شوق سے دو اور تین اور چار رکعت کو ایک کریں کسی اصول کی کے تحت نہیں بلکہ علی الحساب بے ضابطہ، اور میں دو کو ایک، جس کو عقل بھی تسلیم کرتی ہے۔

سلہ "اتل ما اوحی الیک من الکتب" (۲۹/۴۵) میں کتاب سے آنحضرتؐ کے قلب تک "ما اوحی" کی حرکت ہے اور آنحضرتؐ کے قلب سے علیحدہ شے ہے، یا حد فاصل دو صل کتاب و قلب میں ہے جیسے ایک خط دو نقاط میں۔

فطرت اللہ، فطرتِ انسانی اور دینِ فطرت؟

مسلمان عام طور پر یہ مانتے چلے آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا ہے اور اسلام دین فطرت ہے۔ یہ ایسے مسلمات ہیں کہ انھیں تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کا سوال ہی ذہنوں میں نہیں آتا۔ (یوں بھی مسلمان اپنے عقائد و معمولات کو تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کے لئے کہاں تیار ہوتے ہیں!) اشاعتِ رواں میں "سلیم کے نام" کے عنوان کے تحت محترم پرویز صاحب نے قرآنی روشنی میں ان مسلمات کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ "فطرت" (الٰہی یا انسانی) کا مفہوم کیا ہے۔ یوں تو پرویز صاحب کے کسی مضمون کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خصوصی توجہ کا مستحق نہیں، لیکن اس مضمون میں چونکہ مسلمات کو زیر بحث لایا گیا ہے اور پہلی مرتبہ اس انداز سے بحث کی گئی ہے اسلئے ہم قارئین سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اس مضمون کو امعانِ نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ بہ تقاضائے نفس موضوع انداز بحث عالمانہ ہے، اسلئے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کیلئے اسے بار بار پڑھنے کی ضرورت ہوگی۔

ہمیں یقین ہے کہ پرویز صاحب کا سادہ اور دلکش پیرایہ بیان اس تکرار میں قند مکرر و سہ کرر کی چاشنی پیدا کر دے گا۔

باب المراسلات

۱۔ رسول کریم صلعم کی شانِ اطہر میں سوءِ ادبی

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ آئے دن اخبارات میں کوئی نہ کوئی خبر اس قسم کی شائع ہوتی رہتی ہے کہ فلاں عیسائی یا فلاں ہندو نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے کلمات لکھے ہیں۔ ایسی خبر کے بعد چند روز کے لئے ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کا بدلہ خود لے لیا جاتا ہے اور کبھی قانون کے ذریعے ایسی کتابوں یا رسالوں کو ضبط کرا دیا جاتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے اور کسی ایسی خبر پر دوبارہ جاگ اٹھتا ہے۔ کیا کوئی ایسی تدبیر نہیں کی جا سکتی کہ اس قسم کی باتیں لکھی ہی نہ جائیں تاکہ آئے دن ہمارے جذبات مجروح نہ ہوں۔

طلوع اسلام

حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے خلاف دریدہ دہنی ایک ایسی ننگِ انسانیت گستاخی بلکہ شرف و احترام آدمیت کے خلاف جرم ہے کہ ہم جیسے عالم تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمارا تو اس باب میں یہ عالم ہے کہ حضورؐ کی ذات گرامی تو ایک طرف، پچھلے دنوں جب اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ روضۂ اقدس کے کچھ ستونوں میں دراڑ سی آگئی ہے، تو یقین مانئے، اس خبر نے ہم پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خود حضورؐ کی ذات اقدس کے خلاف کسی سوءِ ادبی کو بھی کس طرح برداشت کیا جا سکتا ہے۔

کے توانم دید زاہد جام صہبا بشکند   می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

لیکن ان باتوں کا سدباب ہمارے اور آپ کے جذبات سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ علامات مرض کی بجائے علت مرض کی تشخیص کی جائے اور اس کے بعد اس کا علاج۔

سوال یہ ہے کہ نبی اکرم صلعم کی ذات گرامی کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے، اس کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یعنی کیا یہ لوگ اس قسم کے قصے یونہی از خود وضع کر کے شائع کر دیتے ہیں یا انہیں کہیں سے لیا جاتا ہے۔ یورپ کے مستشرقین کی کتابیں اس قسم کی لغویات سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن سوال پھر بھی پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے ان لغویات کو از خود وضع کیا ہے یا کہیں سے نقل کیا ہے۔ آپ کے لئے شاید یہ چیز موجب استعجاب ہو کہ مستثنیات کے سوا اس قسم کی تمام لغویات و خرافات کا ماخذ خود ہمارے اپنے ہاں کی کتابیں ہیں۔ اور وہ کتابیں بھی بازاری قصے کہانیوں کی نہیں بلکہ وہ کتابیں کہ جنھیں ہم ہزار برس سے سر پر اٹھائے اٹھائے اور سینوں سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں۔ یعنی ہمارے ہاں کی احادیث اور تفاسیر کی کتابیں۔ تفاسیر کے متعلق تو پھر بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی عام انسان کے

خیالات ہیں لیکن احادیث کے متعلق تو ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ وہ خود رسالت مآب صلعم کے اقوال و افعال کا مجموعہ ہیں۔ اگر آپ ان احادیث کے مجموعوں کو اٹھا کر دیکھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ ان میں وہ سب کچھ موجود ہے جنھیں ہم عیسائیوں اور ہندوؤں کی کتابوں اور رسالوں میں نقل شدہ دیکھ کر اس طرح آتش در پیراہن ہو جاتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر ہمارا خون کھولنا بجا ہے۔ لیکن ہماری بدبختی یہی ہے کہ ہم ان کتابوں کو جن سے یہ خرافات لی جاتی ہیں اپنے ہاں کے مقدس ترین صحائف بلکہ "من جانب اللہ" وحی قرار دیتے ہیں اور جب کوئی انہی چیزوں کو اپنے ہاں نقل کر دیتا ہے تو اسے گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ ہم اسے اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہم لکھ رہے ہیں اسے آپ کبھی صحیح باور نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ آپ اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے ہاں کی ایسی برگزیدہ کتابوں میں اس قسم کی باتیں بھی لکھی ہوئی ہوں گی۔ اس کے سمجھانے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ کہ یا تو ہم اپنے ہاں ان چیزوں کو نقل کر کے دکھا دیں۔ لیکن اول تو ہم میں ہی اتنی ہمت نہیں ان چیزوں کو جو حضور سرور کائنات صلعم کی ذات اقدس کے خلاف ہوں ایسا کچھ کہہ ہی ہوں، طلوع اسلام شائع کر دے اور اگر محض اس مقصد کی خاطر ان چیزوں کو پیش بھی کر دیا تو ہمیں خود اندیشہ ہے کہ اس سے عوام کے جذبات نہایت شدت سے مشتعل کر دیئے جائیں گے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو از خود پڑھیں۔ ہم آپ سے یہ التماس کرتے ہیں کہ آپ صرف ایک "بخاری شریف" ہی کو لیں جسے "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، اور پھر دیکھیں کہ اس میں رسول اللہ صلعم کی شان کے خلاف کیا کیا کچھ لکھا ہے۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرما لیں کہ دیگر کتب احادیث اور تفاسیر میں کیا کیا کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس مرض کا علاج چور کی بجائے چور کی ماں کو کرنا ہے۔ جب تک آپ اپنے ہاں ان کتابوں کو علی حالہ رائج رکھیں گے اور انھیں مستند، معتبر، صحیح اور مقدس بیان کرتے رہیں گے، غیر مسلم ان چیزوں کو اپنے ہاں درج کر کے اسلام اور حضور رسالتمآب صلعم کے خلاف نفرت پھیلاتے رہیں گے۔ آپ اپنے گھر کو اس لغویت سے پاک کیجئے اور اس کے بعد ہر ایسے مصنف سے جو اس قسم کی لغویات اپنے ہاں کرے پوچھئے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ماخذ کیا ہے۔ جب آپ کے ہاں کا مذہبی لٹریچر پاک اور صاف ہو جائے گا تو پھر ایک آدھ نسل کے بعد اس قسم کے دریدہ دہن پیدا ہونے خود بخود بند ہو جائیں گے۔ مچھروں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ اپنے ماحول کی صفائی ہوتا ہے۔ خالی فلٹ چھڑکنا نہیں۔ یہ کام درحقیقت اسلامی حکومتوں کے کرنے کا ہے کہ وہ ہمارے ہاں کی ان کتابوں کو ان خرافات سے پاک کریں جو دور اول کے یہود اور نصاریٰ اور مجوسیوں کی منظم سازش کے ذریعے ہمارے ہاں داخل ہو چکی ہیں۔ اس کام کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے اور یہ جرأت وہی کر سکتا ہے کہ جس کے اندر اتنی قوت ہو کہ وہ مذہبی پیشواؤں کے سہاروں کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکے۔ اس باب میں سردست ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دیکھیں:۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

۲۔ رسول اللہ صلعم اور غیب کا علم

ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے طلوع اسلام میں احادیث کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے اس سے آپ نے یہ نہیں سوچا کہ رسول اللہ صلعم کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو جاتا ہے کہ آپ کو غیب کا علم نہیں تھا۔ مثلاً آپ نے ایک جگہ یہانتک لکھ دیا ہے کہ جب رسول اللہ صلعم کے پاس کوئی مقدمہ آتا اور فریق متعلقہ اس میں غلط بیانی سے کام لیتا تو حضور اس کے بیان کو پیش نظر رکھ کر ہی فیصلہ فرما دیتے۔ گویا آپ کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ اس سے رسول اللہؐ کی شان بہت گر جاتی ہے۔ یہ احادیث کو نہ ماننے کا نتیجہ ہے۔

طلوع اسلام

ہمارے یہ بھائی اپنے غصے میں یہ بھی بھول گئے کہ وہ جس بات پر اعتراض کر رہے ہیں وہ خود حدیث ہی میں ہے، ہم نے اپنی طرف سے نہیں لکھا یعنی یہ حدیث میں موجود ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جب تم میرے پاس مقدمات لاتے ہو تو میں تمہارے بیانات کے مطابق ہی فیصلہ دیتا ہوں۔ اگر کوئی شخص جھوٹ بول کر مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیتا ہے تو وہ جہنم کی آگ ہے۔ یہ حدیث ہمارے نزدیک اس لئے صحیح ماننے کے قابل ہے کہ اس کا مضمون قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن میں بار بار رسول اللہ صلعم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ مجھے غیب کا علم نہیں، بجز ان باتوں کے کہ جو قرآن کے اندر درج ہیں۔

باقی رہا یہ کہ رسول اللہ صلعم کی شان مبارک، احادیث کو حضورؐ کے ارشادات مان کر بڑھتی ہے یا گر جاتی ہے، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے احادیث کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر آپ سننے کی تاب رکھیں تو ہم اسی باب میں (یعنی رسولؐ اللہ کے فیصلوں کے باب میں) صرف ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔ اس سے آپ خود جس نتیجے تک پہنچیں ہمارے لئے وہی کافی ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم باب برأت حرم النبی صلعم میں موجود ہے اور اس کا متن یہ ہے:۔

ان رجلا کان یتہم بام ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلی اذہب فاضرب عنقہ۔ فاتاہ علیؓ فاذا ھو فی رکیۃ یتبرد فیھا فقال لہ علی اخرج فناولہ یدہ فاخرجہ فاذا ھو مجبوبٌ لیس لہ ذکرٌ۔ فکف علی عنہ ثم اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انہ لمجبوبٌ مالہ ذکرٌ۔ (عن انس)

ترجمہ اس کا یہ ہے:۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص پر رسول اللہؐ کی ام ولد سے زنا کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جاؤ اور اس شخص کو قتل کر دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس پہنچے تو وہ کنوئیں میں نہا رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ باہر نکلو۔ اس نے اپنا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیدیا۔ حضرت علیؓ نے اس کو نکال کر دیکھا تو وہ ہیجڑہ تھا اور اس کا عضو مخصوص ہی نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے اس کے قتل سے ہاتھ روک لیا اور رسول اللہ صلعم سے آکر کہا کہ وہ تو ہیجڑہ ہے۔ اس کا عضو مخصوص ہی نہیں۔

ہم نے سینے پر پتھر رکھ کر مسلم شریف کی اس حدیث مقدس کو نقل کیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی ہمارا یہ بھائی یہ سمجھتا رہے کہ احادیث کو دین ماننے سے رسول اللہؐ کی شان بڑھتی ہے تو ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔ یہودیوں اور مجوسیوں کی یہ سازش بڑی گہری تھی اور آج ہمارا مولوی صاحبان کا طبقہ اس سازش کو زندہ، پائندہ اور تابندہ رکھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کے پاس اسلاف کے نام کی نسبتیں بھی ہیں، وضع قطع کا تقدس بھی ہے، عوام کی نجات کے لئے سرٹیفکیٹ بھی ہیں اور اس لئے ان کے جذبات کے سیلاب کی قوت بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ارباب دولت و ثروت کی حمایت بھی جو سمجھتے ہیں کہ علماء کی خدمت کرنے سے نجات مل جاتی ہے۔ ان کے خلاف طلوع اسلام کے پاس ان حربوں میں سے کوئی حربہ بھی نہیں،

گھر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں!

۳۔ شراب کا استعمال بطور دوائی

پچھلے دسمبر میں ہم نے باب المراسلات کے تحت امتناع شراب کے قرآنی حکم کی توضیح کی تھی۔ اس سلسلہ میں مقامی میڈیکل کالج کے ایک طالب علم لکھتے ہیں کہ شراب کئی دواؤں کا جز ہے اور وہ دوائیں کئی امراض میں مفید اور مجرب ثابت ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ پوچھتے ہیں کہ کیا شراب کا یہ استعمال جائز ہے یا نہیں۔

طلوع اسلام

اس قسم کے استفسارات ہمارے پاس اکثر و بیشتر آتے رہتے ہیں، اور ہم ان کا جواب دینے میں تامل برتتے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ ہمارے تصور کے مطابق دین کوئی ذاتی شے نہیں۔ یہ ایک اجتماعی نظام ہے۔ لہٰذا اجتماعی نظام سے متعلق امور کا فیصلہ مفتیانہ حیثیت سے نہیں کیا جاتا، قانونی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اسلامی حکومت میں ان کا استعمال قانونی جرم بھی ہوتا ہے۔ جب وہ حکومت اس کے متعلق قانون مرتب کریگی تو وہ اس جرم سے متعلق تمام تفاصیل، اس کے تضمنات، اس کے عواقب اور مخصوص حالات میں مستثنیات وغیرہ سب کا ذکر کریگی۔ اس کے بعد اس جرم کے متعلق ان تمام امور کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ قرآن نے اضطراری حالت میں حرام اشیا کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ اضطراری حالت کسے کہتے ہیں؟ اس حالت میں ممنوع اشیاء کا استعمال کس حد تک جائز ہوگا؟ وغیرہ امور بھی قانون سے متعلق ہیں، اور قانون ہی اس کا صحیح صحیح تعین کرے گا۔ اس میں نہ کسی فرد سے فتویٰ مانگنے کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی کو فتویٰ دینے کا حق ہی ہوگا۔ بجز ان ذمہ دار لوگوں کے جن کو خود حکومت نے ان کاموں کے لئے مامور کیا ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں زیر نظر استفسار کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ البتہ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی جگہ اسلامی قانون رائج نہ ہو تو انفرادی طور پر ان احکام کی پابندی کس طرح کی جائے۔ سو اس کا جواب سوائے اس کے اور کیا دیا جا سکتا ہے کہ ان امور کی پابندی اپنے اپنے طور پر کی جائے۔ شراب کی ممانعت کے متعلق ہم دسمبر کے پرچے میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس کی اجازت اضطراری حالت میں ہی دی جا سکتی ہے۔ بیماری کی حالت، اضطراری

حالت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ کہ کس بیماری اور بیماری کی کس حالت میں شراب کا، یا کسی ایسی دوائی کا جس میں شراب کی آمیزش ہو، استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے، صرف ایک ڈاکٹر ہی دے سکتا ہے۔

۴۔ شب برات

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ شب برات کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے؟ اس کی مذہبی حیثیت (Significance) کیا ہے؟

طلوعِ اسلام

شب برات کے متعلق اس سے پہلے بھی طلوعِ اسلام میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ تہوار نہ تو کسی واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی مذہبی حیثیت ہے۔ بس ایک بھیڑ چال ہے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے اور کسی کو یہ توفیق نصیب نہیں ہوتی کہ ذرا ٹھہر کر سوچے کہ بالآخر یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ البتہ اس سے اس حقیقت کی کھلی ہوئی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے خلاف عجمی سازشیں کس قدر کامیاب رہیں اور پروپیگنڈہ (اگر منظم طریق پر کیا جائے) تو وہ کیا سے کیا کچھ بنا دیتا ہے۔

جب ایرانیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تو وہ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ مسلمانوں سے میدانِ جنگ میں تو شکست کھا گئے، لیکن انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس شکست کا انتقام اس طریق سے لیا جائے گا کہ اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے۔ ایرانی فوجوں میں شاہی جیش کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ اس جیش کا نام اساورہ تھا۔ اپنی شکست کے بعد اس جیش نے حضرت سعدؓ سے درخواست کی کہ اگر انھیں وہی مراعات دی جائیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں تو وہ مسلمان ہو کر اسلامی آبادیوں میں بس جانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ شرط منظور کر لی گئی اور وہ اس طرح بصرہ اور کوفہ وغیرہ بلادِ اسلامی میں آ بسے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے اس انتقام کی سازش شروع کی جس کی آگ ان کے دلوں میں سلگ رہی تھی۔ اس وقت اسلام اپنی اصلی شکل میں سیدھے سادے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے موجود تھا۔ مسلمان اس ضابطۂ حیات پر ایمان رکھتے تھے اور اسے دنیا میں عملاً نافذ کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ کام کرنے والی قومیں باتیں کرنا نہیں جانتیں۔ اس لئے اس وقت مسلمان "باتوں" میں الجھے نہیں تھے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ان اساورہ نے یہ سوچا کہ اس "زندۂ عمل" قوم سے کام چھڑانے کا طریقہ یہ ہے کہ انھیں باتوں میں الجھاؤ۔ خیر و شر کا مسئلہ مجوسیت (ایران مذہب) کا بنیادی مسئلہ تھا۔ اسی مسئلہ پر تقدیر کے نظریہ کی عمارت متفرع ہوتی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے اسی سوال کو چھیڑا۔ وہ جن مسلمانوں سے اسلام سیکھتے تھے ان سے پوچھتے تھے کہ "اگر کائنات کا کوئی ذرہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا تو انسان کے تمام اعمال بھی خدا کے حکم کے ماتحت ہی سرزد ہوں گے۔ اور اگر یہ سب کچھ خدا کے حکم کے مطابق ہوتا ہے تو پھر جزا اور سزا کا کیا سوال؟" مسلمانوں کی عملی قوم نے

اس قسم کے سوالات کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا۔ اور یہ مجوسی معترضین اس فن میں طاق تھے۔ انھیں مجبوراً ان باتوں کے متعلق سوچنا پڑا اور ان کے اعتراضات کے منطقی جوابات تلاش کرنے پڑے۔ ان سوالات اور جوابات نے عقائد کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے قدری فرقہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس فرقہ کے بانی معبد بن خالد جہنی کا اپنا اعتراف ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو اساورہ کے ایک شخص ابولونس سے اخذ کیا تھا۔ قدریہ کا ردِ عمل جبریہ کی صورت میں رونما ہوا۔ اس طرح جب ایک مرتبہ فرقہ بندی کی ابتدا ہو گئی تو اس کے بعد پھر چل سو چل۔ مجوسی اساورہ نے یہ کچھ اس خاموشی سے کیا کہ کوئی بھانپ ہی نہیں سکا کہ اسلام کی گاڑی کس طرح دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ انھوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ اسے مسلمانوں میں جزوِ ایمان بنا دیا۔ چنانچہ ہمارے ایمان میں "والقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ" کا چھٹا جزو انہی کا داخل کیا ہوا ہے۔ اسی عقیدہ کو زیادہ گرہ گیر بنانے کے لئے انھوں نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ سال میں ایک رات ایسی آتی ہے جس میں آنے والے سال کے تمام معاملات طے کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ فلاں شخص مریگا، فلاں کے ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ فلاں کا رزق کھلے گا۔ فلاں کا بند ہوگا۔ یعنی محکمۂ قضا و قدر ہر ایک کے حصے مقرر کر دے گا۔ اس رات کا نام "شب برات" رکھا گیا۔ برات کے معنی حصہ ہیں۔ یعنی "حصے بٹنے کی رات"۔ اب رہا اس کی سند کا سوال۔ سو اس کے لئے انھوں نے الگ انتظام رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کے ہاں قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں ردوبدل اور حک و اضافہ ناممکن ہے۔ اس لئے انھوں نے پہلے یہ عقیدہ پھیلایا کہ دین سب کا سب قرآن ہی میں نہیں۔ قرآن کے ساتھ (مثلہٗ معہٗ) ایک اور چیز بھی ہے اور وہ ہیں احادیث۔ احادیث کا کوئی مجموعہ رسول اللہؐ نے مرتب کر کے دیا نہ تھا کہ اس میں ردوبدل یا اضافہ کی گنجائش نہ ہوتی۔ سنی سنائی باتوں کو (رسول اللہ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد) جمع کرنا شروع کیا اور ان کا نام رکھ دیا "سنتِ رسول اللہؐ"۔ اب اس طرح کی پھیلی ہوئی باتوں میں نئی نئی باتیں شامل کر دینا کونسا مشکل کام تھا۔ عربی کے چند فقرے وضع کئے۔ دو چار راویوں کا نام ان سے پہلے چپکایا۔ آخر میں لکھدیا "قال قال رسول اللہ"۔ بس حدیث تیار ہے۔ شب برات کی فضیلت میں بھی اسی قسم کی ایک حدیث وضع کر دی گئی۔ اس کے بعد اس عقیدہ کے عین دین بنجانے میں کونسی کسر رہ سکتی تھی؟ یوں شب برات وجود میں آ گئی۔ اب مسلمان ہزار برس سے مجوسیوں کے "نوروز" کے اس شئی کو عینِ اسلام سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھر رہا ہے اور اس کے بچے آتشبازی سے ان کی آتش پرستی کی بھی یاد تازہ کرا دیتے ہیں۔ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اتنا کہدے کہ خدا کے لئے ذرا سیلاب کی اس رَو سے ہٹ کر سوچو تو سہی کہ بالآخر اس تقریب کی دینی حیثیت ہے کیا؟ تو اس کے خلاف کفر کے فتاوی شائع کر کے اس مجوسی سازش کی تقویت کا سامان بہم پہنچا دیا جاتا ہے۔

خدایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے

نقد و نظر

ISLAMIC IDEOLOGY – I
(انگریزی)

مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، سابق صدر شعبہ فلسفہ، عثمانیہ یونیورسٹی، حال ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، لاہور۔ پبلشرز، پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ۔ لاہور

شائع کردہ منجانب انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، لاہور۔ صفحات ۳۲۳ - کاغذ اتنا موٹا اور پھولا ہوا کہ کتاب کی ضخامت دوگنی محسوس ہوتی ہے۔ قیمت درج نہیں، غالباً ساڑھے بارہ روپے۔

ہم اس حقیقت کو کئی مرتبہ دہرا چکے ہیں کہ ہمارے ہاں کسی زبان میں کوئی انسانی تصنیف ایسی نہیں جسے ہم کسی کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر سکیں کہ اس کتاب سے صحیح اسلام سمجھ میں آجائیگا۔ ہماری یہی خلش جستجو ہے جو ہمیں ہر اس کتاب کی طرف کشاں کشاں لیجاتی ہے جس کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ اس میں اسلامی تعلیم کو پیش کیا گیا ہے۔ یہی کشش تھی جس کی وجہ سے ہم نے زیر نظر کتاب کو لپک کر لیا۔ ایک تو کتاب کا عنوان بڑا جامع تھا، اس پر مصنف وہ جو ..... ایک زمانے تک فلسفہ کے استاد رہے ہیں اور آج کل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور کے ڈائرکٹر ہیں اور یہ کتاب اس انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اولیں پیشکش ہے۔ کتاب کی فہرست مضامین بھی بڑی وقیع ہے۔ مثلاً ایمان کی راہ میں حائل ہونے والی دیواریں، قرآنی نظریہ علت و معلول، صفات خداوندی، مسئلہ خیر و شر، عبادت اور خدمت، اسلامی اخلاقیات، اسلامی مملکت کے بنیادی تصورات، مختلف تصورات حیات کا تقابلی مطالعہ اور محمد (صلعم) اور مارکس، وغیرہ

کتاب کے مطالعہ کے بعد ہم نے دیکھا کہ اس میں دو چیزوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی تصورات کو معقولیت (Rationalism) کے رنگ میں پیش کیا جائے اور اس طرح اس کا دامن مُلّا ازم کی جھاڑیوں سے چھڑا دیا جائے، اور دوسرے یہ کہ اس حقیقت کو ثابت کیا جائے کہ کائنات مادہ کی چار دیواری ہی میں محبوس نہیں بلکہ مادہ سے ماوریٰ ایک اور عالم بھی ہے جو زندگی اور اس کی اقدار کا سرچشمہ ہے۔ یہ ہر دو عنوانات نہایت اہم ہیں اور ان موضوعات پر عالمانہ انداز میں ہر ریسرچ کی کوشش بڑی مسعود ہے۔ اس حد تک ہم مصنف کو قابل مبارکباد سمجھتے ہیں۔ یہ الگ چیز ہے کہ ان کی یہ کوشش کامیاب رہی ہے یا نہیں۔

جہاں تک مسئلہ اول کا تعلق ہے (یعنی اسلام کو مُلّا ازم کی توہم پرستیوں سے پاک و صاف کرنا) یہ بڑا اہم کام ہے، لیکن یہ صرف تخریبی پہلو یعنی حصہ لا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی تصور صرف حصہ لا سے تکمیل پذیر نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے تعمیری پہلو یعنی مقام الا کا صحیح، واضح اور متعین حصہ پیش کرنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے (یعنی یہ کہ اس مادی دنیا کے ماوریٰ ایک اور عالم بھی ہے) سو یہ مسئلہ اسلام ہی سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب میں بطور قدر مشترک پایا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ مذہب کی اساس و بنیاد ہی اس مسئلہ پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے عیسائی علماء نے اس مسئلے پر بہت کچھ لکھا ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ بہت عمدہ لکھا ہے۔ ایسا عمدہ کہ وہاں کے کئی ائمہ طبیعیات ان کے خیالات سے متاثر ہو کر خود طبیعیات کے

راستے سے تسلیم کرنے لگ گئے کہ مادی دنیا کے ماوریٰ ایک اور دنیا بھی ہے۔ لہذا اگر آج ہم اپنے دلائل و براہین سے یہ ثابت کر دیں کہ مادی دنیا کے پیچھے ایک غیر مادی دنیا بھی ہے تو اس سے زیادہ سے زیادہ نفس مذہب کے امکان کا ثبوت مل جائیگا۔ اسلام کی خصوصیات کبریٰ کہ جن کی بنا پر اس کا دعویٰ اور ہمارا ایمان ہے کہ نوع انسانی کو اس کی منزل مقصود تک لیجانے کے لئے اسلام کی پیش کردہ راہ کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ثابت نہیں ہوسکے گا۔

زیر نظر کتاب میں اسی چیز کو بار بار دہرایا گیا ہے (اور یہ اس کتاب کی خصوصیت ہے کہ اس میں ایک ہی چیز کو کئی مرتبہ دہرایا گیا ہے) کہ مادی دنیا کے علاوہ ایک اور دنیا بھی موجود ہے۔ لیکن اس کیلئے بھی دلائل کی سطح، نہ طبیعیاتی نقطۂ نگاہ سے اور نہ فلسفیانہ زاویہ نظر سے، اتنی دقیع اور بلند ہے جتنی اس باب میں مغرب کے حامیان مذہب کے ہاں ملتی ہے۔ مثلاً پرنسپل کیئرڈ، ڈین انج، ڈاکٹر آٹو، ڈاکٹر فاولٹن شین وغیرہ اس موضوع پر زیادہ مدلل لکھ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ ایڈنگٹن جیسا Physicist جو کچھ اپنی مختصر سی کتاب Science and the unseen World میں لکھ گیا ہے وہ اختصار کے باوجود نہایت دلنشین ہے۔ Ouspensky کی تینوں کتابیں اور اس کے استاد گرجیف کی تصنیف بھی اس موضوع پر ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔

جہانتک قرآن سے استنباطات کا تعلق ہے، اس کتاب میں بعض باتیں ایسی غلط فہمیوں پر مبنی ہیں جو عوام میں تو ضرور رائج ہیں لیکن جن کی ایک ایسے شخص سے توقع نہیں کی جاسکتی جو قرآنی ریسرچ کر رہا ہو۔ مثال کے طور پر چند ایک باتیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

۱۔ کتاب کے پہلے صفحے (تمہید میں) یہ لکھا ہے کہ انسان کو زمین پر خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا۔ خلیفہ کے معنی جانشین کے ہیں اور جانشینی ہمیشہ کسی پیش رو کے چلے جانے کے بعد ہوتی ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۃ الرسول یعنی حضورؐ کی تشریف براری کے بعد آپ کے جانشین تھے۔ لہذا خلیفۃ اللہ یعنی خدا کے جانشین کا تصور قرآنی تصور نہیں ہے۔

اسی طرح ص ۲۰۸ پر لکھا ہے کہ اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) صرف خدا کیلئے ہے اور اس نے اپنا یہ اقتدار صاحبان کردار و سیرت کو تفویض کر دیا ہے۔ یہ تصور بھی غیر قرآنی ہے۔ خدا اپنے اقتدار کو کسی کو تفویض نہیں کرتا۔

۲ــ کتاب میں متعدد مقامات پر لکھا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ حتیٰ کہ ایک مقام پر تو یہانتک بھی لکھ دیا گیا ہے کہ اس نے ہمیں اپنی شکل پر پیدا کیا۔ (ص ۷۹)

اسی طرح اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خود ہماری اپنی فطرت کے اتباع کا نام ہے۔ (ص ۸۴)

یہ تصور بھی صحیح نہیں۔ اس باب میں اتفاق سے طلوع اسلام کی اسی اشاعت میں محترم پرویز صاحب کا ایک مضمون (سلیم کے نام) شائع ہو رہا ہے جس میں اس عقیدہ کے متعلق نہایت عمدگی سے بحث کی گئی ہے۔

۳ــ تمہید کے ص ۱۲ پر لکھا ہے کہ شریعت کے دو اجزاء ہیں، قرآن کی تعلیم اور مستند احادیث، اور ان کا مجموعہ (یعنی شریعت) ازلی اصولوں پر مبنی ہے۔ یعنی مصنف کے نزدیک مستند احادیث بھی قرآن کی طرح ازلی اور غیر متبدل ہیں۔ کیا ہم محترم مصنف سے پوچھ سکتے ہیں کہ (۱) کسی حدیث کے مستند ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اور (۲) اگر قرآن کے اصول اور احادیث رسول اللہ دونوں ازلی اور ابدی ہیں تو ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

۴۔ تمہید ص ۱۶ پر لکھا ہے کہ خیر اور شر مطلق (Absolute) ہیں لیکن ان کے تاریخی مشہودات اضافی اور متبدل ہیں۔

خیر اور شر کا مسئلہ فلسفہ اور مذہب دونوں کا نہایت اہم مسئلہ ہے۔ مجوسیت نے اس کا حل یہ تلاش کیا کہ خیر اور شر کو دو مطلق قوتیں قرار دیدیا اور اس سے ثنویت (Dualism) کا عقیدہ بہ حیثیت اصول مذہب وجود میں آیا۔ ہمارے قابل مصنف یہ فرماتے ہیں کہ قرآنی تعلیم کی رو سے بھی خیر اور شر مطلق ہیں۔ کیا ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ اس عقیدے میں اور مجوسیت کے عقیدے میں کیا فرق ہے؟

۵ — تمہید ص۱۸ پر لکھا ہے: "قرآن کہتا ہے کہ ارض اور سموات میں ہر شے انسان کیلئے مسخر کردی گئی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی حقیقی ذات کے مطابق زندگی بسر کرے اور اپنی مرضی کو "کائناتی رضا" (Universal will) سے ہم آہنگ کرے۔

کیا محترم مصنف فرمائیں گے۔ قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ کائنات کی قوتیں انہی انسانوں کے تابع فرما ہوں گی جو اپنی حقیقی ذات کے مطابق زندگی بسر کریں اور اپنی مرضی کو کائناتی رضا سے ہم آہنگ کریں؟

ضمناً کائناتی رضا (Universal will) کا تصور مغرب سے مستعار لیا گیا ہے۔ مشیت خداوندی کا قرآنی تصور اس سے مختلف اور بلند ہے۔

٦ — تمہید ص۱۹ پر تحریر ہے: "علم اور محبت وہ انتہائی اقدار ہیں جن میں اسلام ان تمام اقدار کو سمو کر رکھ لیتا ہے جن کے مجموعے کا نام نیک زندگی ہے۔"

کیا فاضل مصنف ارشاد فرمائیں گے کہ اس دعوے کی قرآنی سند کیا ہے جس میں فلسفہ کی عقلیت اور عیسائی رہبانیت کے تصور محبت کو یکجا کیا گیا ہے؟ دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ "علم اور محبت" وہ بنیادی اقدار ہیں جن میں تمام دیگر اقدار سمٹ کر آجاتی ہیں اور جن سے ایک مومن کی زندگی عبارت ہوتی ہے۔

۷ — کتاب کے ص٦ پر تحریر ہے کہ "سائنس نے اپنی ابتدا افسانوں، کہانیوں اور توہم پرستیوں سے کی۔ اور اسی طرح مذہب نے بھی اپنی ابتدا کی۔

مغربی مادہ پرستوں کا ایک گروہ ہے جس کا خیال یہ ہے کہ مذہب انسان کے دور جہالت کی پیداوار ہے جو ذہن انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ چنانچہ گرانٹ Grant نے اپنی کتاب Evolution of the idea of God میں اسی تصور کو پیش کیا ہے۔ محترم خلیفہ صاحب بھی یہی تصور پیش کر رہے ہیں کہ سائنس کی طرح مذہب کی ابتدا بھی افسانوں، چیستانوں اور توہم پرستیوں سے ہوئی اور (اس سے اگلا فقرہ یہ ہے) "انسانی ترقی نے ان دونوں سے باطل اور افسانوی تعبیرات کو الگ کیا ہے۔" یعنی مذہب انسان کے دور جہالت میں پیدا ہوا۔ اسوقت یہ توہمات کی افسانہ طرازیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا توہمات کے پردے الگ ہوتے گئے۔

محترم خلیفہ صاحب یہ کچھ "مذہب" کے متعلق فرما رہے ہیں اور قرآن کا ارشاد ہے کہ حضرات انبیائے کرام اس پہلے دن سے جب انسان اپنے دور جہالت میں تھا، اور انسانی شعور نے پہلے پہل آنکھ کھولی تھی، آخری زمانہ (ختم نبوت) تک ایک ہی پیغام لاتے رہے جسے باطل دائیں، بائیں، آگے، پیچھے کہیں سے نہیں چھو سکتا تھا۔ لہذا ایک مسلمان کیلئے یہ کہنا کہ مذہب نے اپنی ابتدا توہم پرستیوں اور افسانہ طرازیوں سے کی، اور جوں جوں شعور انسانی ارتقائی مدارج طے کرتا گیا مذہب کا تصور بھی منزہ ہوتا گیا، بہت بڑی جسارت ہے۔

باقی رہا یہ دعویٰ کہ سائنس نے اپنی ابتدا بھی توہم پرستیوں سے کی، دنیائے سائنس میں بھی قابل قبول نہیں سمجھا جائیگا۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کے ایک دور کے "مسلمات" دوسرے دور میں منسوخ ہو کر دوسرے مسلمات سے بدلتے رہے۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ سائنس کے دعاوی تدریجی طور پر حقیقت سے قریب آتے رہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ سائنس نے اپنی ابتدا توہم پرستیوں سے کی۔ سائنس تو توہم پرستی کے

خلاف صدائے احتجاج (Protest) کا نام ہے۔

۸۔ صفحہ ۲۱ پر درج ہے: "خدا مسبب الاسباب اور علت العلل ہے"۔ کیا فاضل مصنف ارشاد فرمائیں گے کہ ایسا کہاں کہا گیا ہے؟ قرآن تو ایک طرف، علت العلل کا عقیدہ تو اب اہل فلسفہ کے ہاں بھی کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ کاروانِ علم ان وادیوں کو بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ یہ یونانی فلسفہ کا شاخسانہ اور عیسائی مفکرین (Apologists) کا تصور تھا۔

۹۔ اسی صفحے پر ایک اور دلچسپ بیان ملتا ہے۔ فرماتے ہیں: "چونکہ خدا کی صفت تخلیق اس کی لاینفک صفت ہے، اس لئے کسی نہ کسی قسم کی مخلوق کو خدا کے ساتھ قدیم (Co-Existent) ماننا پڑے گا"۔

ہم حیران ہیں کہ خلیفہ صاحب کے اس عقیدے کے متعلق کیا عرض کریں؟ اگر مخلوق (اس کی نوعیت اور کیفیت کچھ ہی کیوں نہ ہو) خدا کے ساتھ (Co-Existent) ہے تو پھر خدائے واحد قدیم کیسے ٹھہرا؟ ..... پھر اگر تخلیق خدا کی لاینفک صفت ہے تو اسی طرح اس کی ہر صفت لاینفک اور قدیم ہے۔ لہٰذا اگر صفتِ تخلیق کیلئے مخلوق کا قدیم ماننا ضروری ہے تو اسی دلیل کی رو سے خدا کی صفتِ علم کے لئے "اشیائے معلوم" کا وجود بھی قدیم ماننا پڑے گا۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس سے تو پوری کی پوری کائنات کو قدیم ماننا لازم آجائے گا۔ یہ خدا کا عجیب قسم کا تصور ہے جسے "ازروئے قرآن" پیش کیا جا رہا ہے۔ دراصل قدم عالم کا یہ وہی عقیدہ ہے جس کا مخترع ارسطو اور مؤید ابن رشد تھا۔

۱۰۔ صفحہ ۳۸ پر تحریر ہے: "اسلام کی رو سے خدا کا ظہورِ اعلیٰ (His Supreme manifestation) اس کے ان بندوں کی بلند اور پاکیزہ روحوں میں ہوتا ہے جو رضا و محبت سے اس کے سامنے جھک جاتے ہیں، یعنی اس کے پیغمبروں میں"۔

یہاں خلیفہ صاحب حلول کے عقیدے کی طرف آرہے ہیں۔ قرآن نے انہی لوگوں کے متعلق کہا تھا ما قدروا اللہ حق قدرہ۔ یہ لوگ خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں کر سکے۔ حضرات انبیائے کرام کے متعلق قرآن نے کہیں یہ نہیں کہا کہ وہ ذاتِ خداوندی کے مظہر ہوتے ہیں۔ یہ عقیدہ انسان کو اسلام کے مشربِ توحید سے بہت دور لے جاتا ہے اور خالص عجم کی پیداوار ہے۔

۱۱۔ صفحہ ۳۶ پر تحریر ہے: "خالقِ مطلق اپنی صفت رحمانیت کی رو سے سب کچھ محبت (Love) سے پیدا کرتا ہے"۔ یہ عیسائیت کے تصوف کا پیدا کردہ خیال ہے اور یکسر شاعری۔ قرآن میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں۔

۱۲۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ مصیبتیں اور تکلیفیں خدا کے پیاروں پر ہی آتی ہیں۔ کیونکہ اس سے ان کا "تزکیۂ نفس" ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تصور رہبانیت کے اس عجمی تصور کی پیداوار ہے جسے عیسائیت نے جنم دیا اور سیاست ملوک کی فریب کوشیوں نے مقدس افیون کی حیثیت سے عام کیا۔ قرآن مصائب اور مشکلات کو خدا کی نعمتیں قرار نہیں دیتا، نہ ہی "روحانیت" کی منزلیں طے کرنے کے لئے لاینفک شرائط۔ وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ دنیا میں مومن کا مقصود حیاتِ باطل کا نظام الٹ کر اس کی جگہ قانونِ خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنا ہے۔ اس جدوجہد میں طاغوتی قوتیں ہر قسم کے موانع پیش کریں گی اور سخت سے سخت مقابلے کیلئے میدان میں اتر آئیں گی۔ ایسے مقامات میں اللہ کے بندوں کی انقلابی جماعت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ حوصلہ نہ ہاریں اور نہایت استقامت اور پامردی (صبر) سے تمام مخالفتوں کا مقابلہ کریں۔ یہ ہے مشکلات کے متعلق قرآنی تعلیم، لیکن محترم خلیفہ صاحب اس باب میں فرماتے ہیں:

> بلند اخلاق اور روحانیت والے انسان ہر کردار لوگوں اور فطرت کے ہاتھوں بری طرح ستائے جاتے ہیں۔ اس قسم کی تکالیف کے متعلق نظریہ توحید یہ ہے کہ نفس انسانی صرف مصائب اور مشکلات کے مکتب میں ہی پاکیزہ اور بلند ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، یہ عیسائیت کا رہبانی تصور ہے؛ قرآنی تعلیم نہیں۔

۱۳۔ صفحہ ۹۲ پر تحریر ہے:

> انسان کے اندر عقل (Reason) خدا کی آواز ہے، اس لئے عقل کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے۔ انسان کو اطمینان قلب صرف اطاعت سے حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس وقت جب اس کے جبلی تقاضے (Instincts) عقل کے تابع ہوں۔

چونکہ (Reason) سے مفہوم عقل لیا جاتا ہے، اسلئے مندرجہ بالا بیان ایک بہت بڑی غلط فہمی کا موجب ہو سکتا ہے۔ ہمارے لئے اطاعت وحی کی ہے، اور چونکہ وحی Reason کی نقیض نہیں، اس لئے وحی کی اطاعت عین تقاضائے شعور و حکمت ہے۔

۱۴۔ صفحہ ۹۸ پر درج ہے: "انسان ایک کل کا جزء ہے اور وہ کل خدا ہے"۔ اس فکرے کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ یہ بھگت کبیر کے دوہوں کا نمونہ ہے، اس فرق کے ساتھ کہ اُس کے دوہے اس کے دل کے ترجمان نظر آتے ہیں اور محترم خلیفہ صاحب کا ارشاد ذہنی آورد محسوس ہوتا ہے۔ حقیقت سے نہ اُس کو تعلق ہے نہ اس کو۔

۱۵۔ صفحہ ۱۴۰ پر ارشاد ہے:

> مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آخرالامر تمام لوگوں کی نجات ہو جائے گی اور جہنم بالکل خالی ہو جائے گا۔

یہ درست ہے کہ عام مسلمانوں کا عقیدہ یہی ہے (اور جو قوم جنت کو جزائے عمل نہ سمجھتی ہو بلکہ اس کے "فی سبیل اللہ" مل جانے پر آس لگائے بیٹھی ہو اس کا عقیدہ اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے)، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فاضل مصنف کے پاس اس عقیدے کی کوئی سند بھی ہے؟

ہمارا خیال ہے کہ جہاں تک عقائد یعنی اسلامی تصورات کا تعلق ہے، انہی چند مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ زیر نظر کتاب کے مصنف کے سامنے یکسر قرآنی حقائق نہیں۔ وہ کچھ تصورات اپنے ذہن میں قائم کئے بیٹھے ہیں جن کا سرچشمہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یونان کی حکمت، عیسائیت کا تصوف، مجوسیت کی ثنویت یا مسلمانوں میں عام مروج عقائد ہیں، اور وہ کوشش یہ کرتے ہیں کہ ان تصورات کو "اسلامی آئیڈیالوجی" کہہ کر پیش کر دیا جائے۔

عقائد (تصورات) کے علاوہ جہاں تک معاملات کی دنیا کا تعلق ہے، وہاں بھی اسی قسم کی کمزور بنیادیں نظر آتی ہیں۔ مثلاً وہ تعدد ازدواج کی مدافعت میں دلیل پیش کرتے ہیں کہ توریت میں خود اس کا حکم موجود ہے۔ اس الزامی جواب کے بعد وہ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ بعض اوقات بیوی کے ہاں اولاد نہیں ہوتی یا وہ بیمار رہتی ہے تو اس صورت میں دوسری شادی ضروری ہو جاتی ہے۔ (صفحات ۱۶۲، ۲۱۳) لیکن قرآن ان میں سے کسی سبب کو بھی دوسری شادی کے لئے وجہ جواز قرار نہیں دیتا۔ (اس باب میں طلوع اسلام میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے)۔

دور حاضر کو عصر معاشیات (The age of Economics) کہا جاتا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ جو حالات اس دور میں پیدا ہو چکے ہیں، ان کے پیش نظر ایسا کہنا بالکل بجا ہے۔ وہ کونسا ذہن ہے جو سوچنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور آج معاشیات کے الجھاؤ میں نہیں الجھا ہوا۔ یہی وہ عالمگیر الجھاؤ ہے جس نے ہر طرف ذہنی انتشار اور فکری تشتت پیدا کر رکھا ہے۔ اس لئے آج ہمارے اس دعوے کی سچائی کی پرکھ کہ اسلام نوع انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے، معاشیات کی میزان میں ہو سکتی ہے۔ اگر ہم آج اسلامی تعلیم کی روشنی میں دنیا کے معاشی الجھاؤ کو سلجھانے کیلئے کوئی کامیاب حل پیش کر سکیں تو یقیناً دنیا کی امامت

ہمارے حصے میں آسکتی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کیفیت یہ ہے کہ ہر شخص منبر اور سٹیج دونوں سے یہ دعوے نہایت بلند آہنگی سے کرتا ہے کہ ان مسائل کا حل اسلام اور صرف اسلام پیش کر سکتا ہے، لیکن دعاوی کی اس قدر بلندیوں کے بعد جب وہ معاشی مسائل کا حل پیش کرتے ہیں تو یوں نظر آتا ہے جیسے قرآن کے الفاظ میں، وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پر آگرے۔ ان کے پیش کردہ حل کے اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں، صدقہ، خیرات، اڑھائی فی صدی زکوٰۃ، بلاسود قرضہ، قانون وراثت، وغیرہ۔

زیر نظر کتاب میں بھی معاشیات کیلئے کافی جگہ وقف کی گئی ہے۔ لیکن آخر الامر حل کم و بیش وہی پیش کئے گئے ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ "مارکس اور محمدؐ" کے سے اہم اور جلی عنوان کے ماتحت معاشی مسائل کے اس قسم کے حل پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری قوم کے نوجوان بجائے اس کے کہ وہ "محمدؐ" کے قریب آئیں، اور زیادہ "مارکس" کے قریب جا پہنچتے ہیں۔ کمیونزم کا فلسفہ دورِ حاضر کا کتنا بڑا فتنہ ہے اور اسلام کی بنیادی تعلیم کے کس قدر خلاف، طلوع اسلام اپنی اشاعت اول سے آج تک اسے نمایاں سے نمایاں تر طریق پر سامنے لاتا چلا آرہا ہے۔ اس نے اس ضمن میں اپنی بساط بھر یہ کوشش بھی کی ہے کہ کمیونزم کے مقابل اسلامی نظام عدل و ربوبیت کو مثبت حیثیت سے بھی پیش کرے۔ جہاں تک ہماری قرآنی بصیرت ہماری رہنمائی کر سکی ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ نظام اسلامی کی یہی آہنی دیوار ہے جو کمیونزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بین الاقوامی معاشیاتی مسائل پر گہری نظر رکھنے والے مسلمان (اگر مسلمانوں کے مختلف ممالک میں اس قسم کے افراد موجود ہیں تو) ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور روایتی اسلام سے الگ ہٹ کر خالص قرآن کی روشنی میں ان مسائل کا عملی حل سوچیں اور پھر اگر وہ سمجھ لیں کہ انھوں نے ایسا حل تلاش کر لیا ہے تو اسے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ نہیں، دنیا کے سامنے پیش کرنے سے پہلے اس کا عملی تجربہ کسی اپنے خطۂ زمین میں کریں، جس کی کامیابی کے نتائج دیکھ کر باقی دنیا خود بخود اس کی طرف چلی آئے۔ اگر سرزمین پاکستان اس باب میں سابقت کر سکے تو یہ خدا کی اس عظیم القدر نعمت کی صحیح سپاس گزاری ہوگی جو انھیں مملکت پاکستان کی شکل میں عطا ہوئی ہے۔

زیر نظر کتاب پر تبصرہ کے ضمن میں ہم ایک چیز محترم مصنف کی خدمت میں بطور شکوۂ اخلاص ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کتاب میں جو گوشے چمکدار نظر آتے ہیں، ان میں بیشتر ایسے ہیں جن میں فکر اقبال سے کسب ضیا کیا گیا ہے، لیکن کتاب میں شروع سے آخر تک اس کے اعتراف میں ایک لفظ بھی کہیں نہیں لکھا گیا حالانکہ مصنف اقبال اکیڈمی لاہور کے صدر بھی ہیں۔ ہمارے نزدیک اگر آج کسی شخص میں اس کی صلاحیت ہے تو کرنے کا کام یہ ہے کہ اقبال کی "تشکیل جدید" کی ایسی شرح لکھدی جائے جس سے قوم کا عام تعلیم یافتہ طبقہ مستفید ہو سکے۔ کچھ تھوڑے سے ردوبدل اور اضافہ کے بعد وہ کتاب ایسی ہو سکتی ہے جسے ہم یہ کہہ کر پیش کر سکتے ہیں کہ اس سے سمجھ میں آجائے گا کہ اسلام کی بنیادی تعلیم کیا ہے۔ لیکن اس کے لئے قرآن، فلسفہ اور تاریخ پر گہری نگاہ رکھنے والے کی ضرورت ہے۔

Time commands Business
LIMTON commands Time

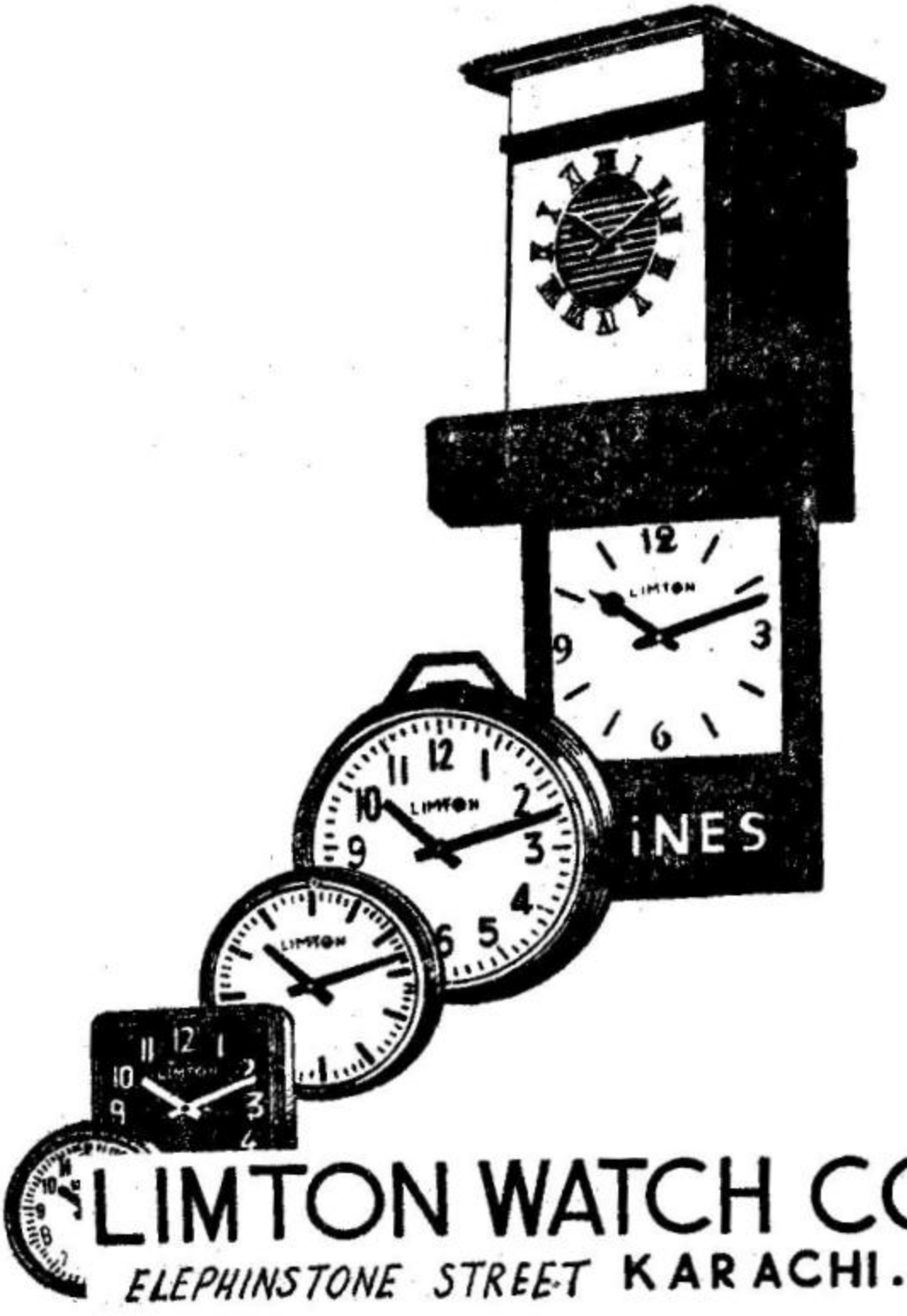

LIMTON WATCH CO.

ELEPHINSTONE STREET KARACHI.